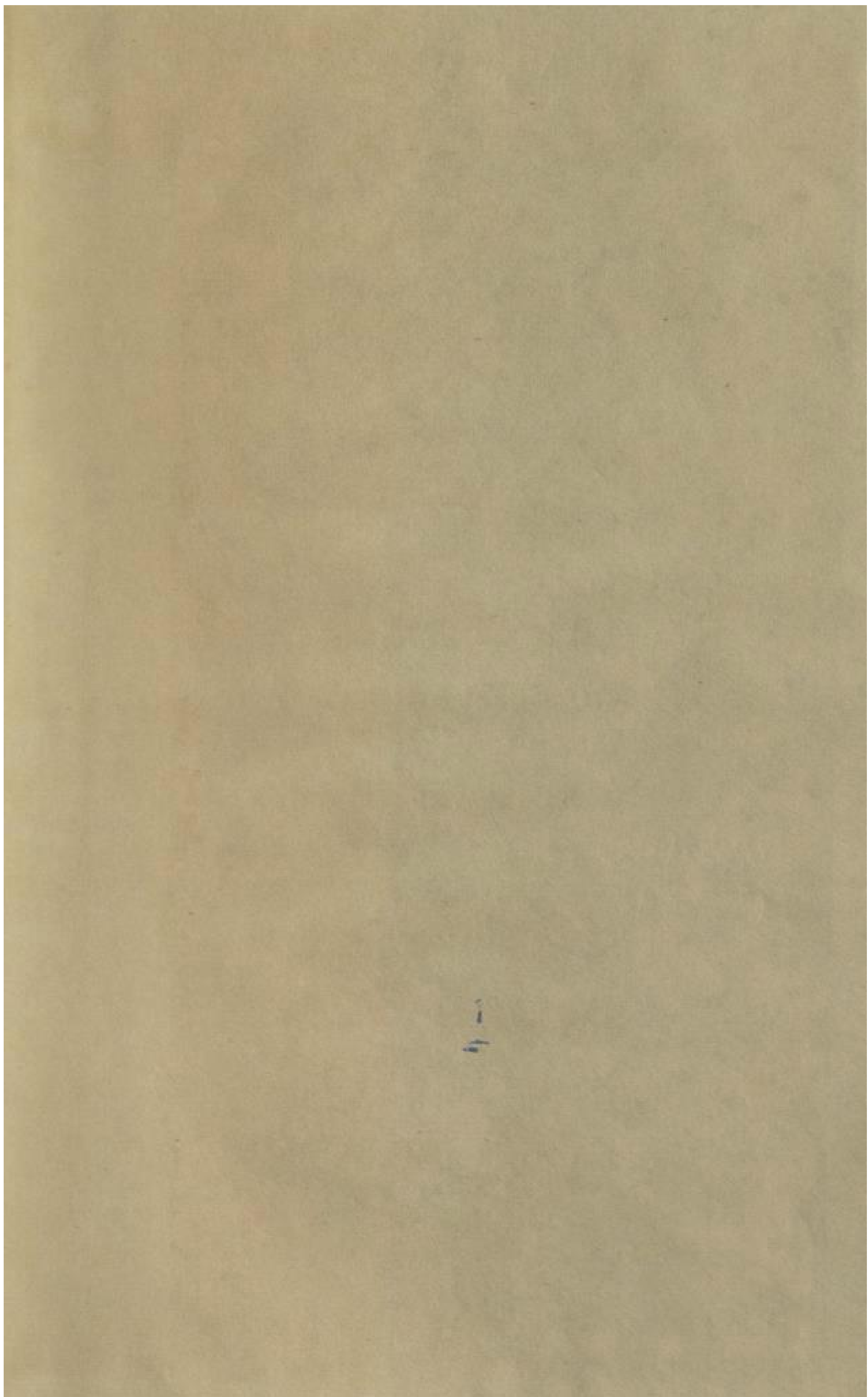
اقبال اور قادیانی

نعیم آسی



اقبال اور قادیانی

نعیم آسی

مسلم اکادمی ◎ سیالکوٹ

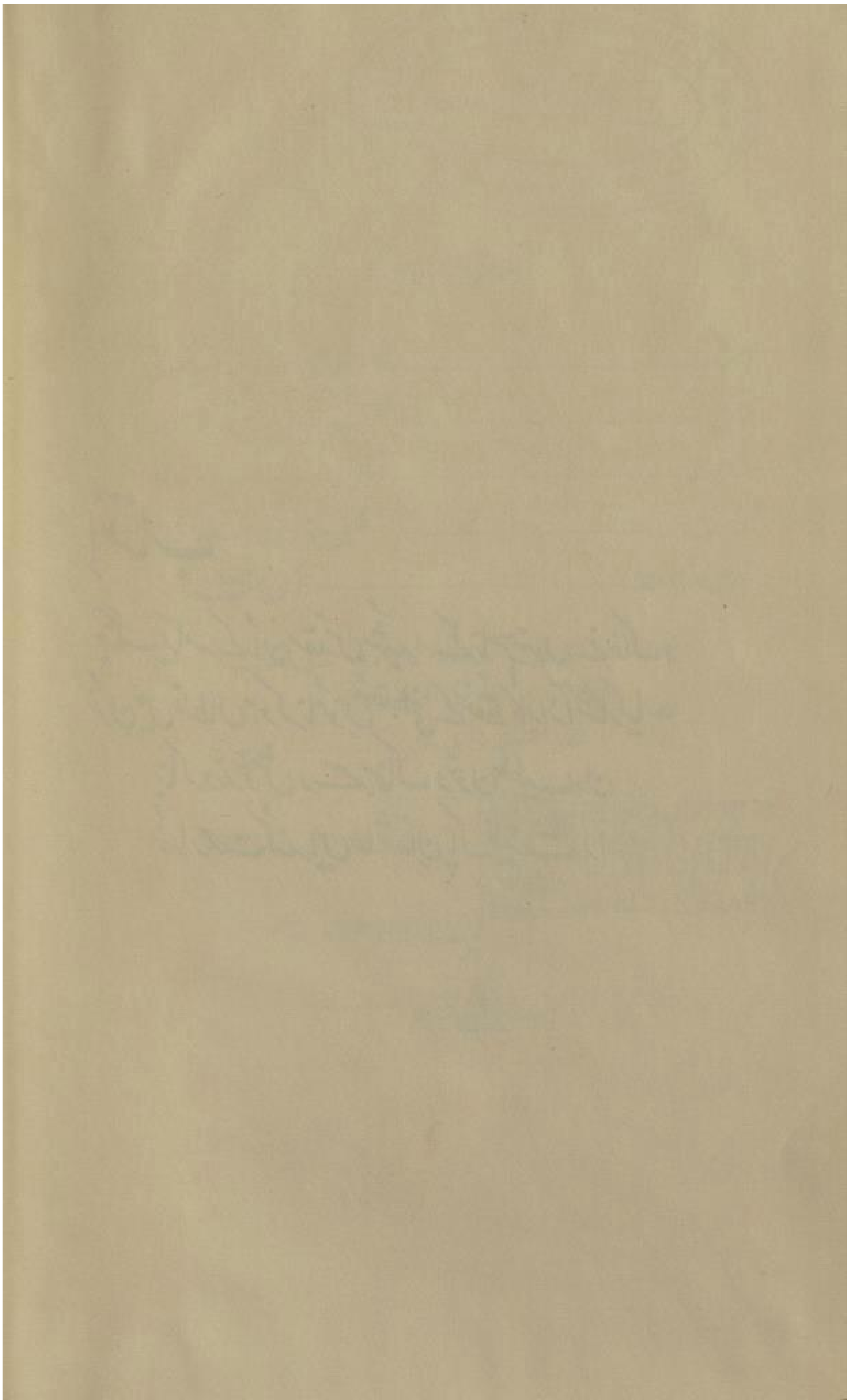
ناشر ــــــــــــ مُسلم اکادمی، وزیرپورہ، سیالکوٹ
طابع ــــــــــــ مکتبہ جدید پریس، لاہور
اشاعت ــــــــــــ اوّل ــــــــــــ ۱۰۰۰
کتابت ــــــــــــ جمیل مرزا، بی اے، رنگپورہ سیالکوٹ
تاریخ اشاعت ــــــــــــ جون ۱۹۷۴ء

قیمت مجلد =/15
پندرہ روپے

اِنتساب

جنگِ یمامہ کے اُن مقدس شُہدا کے نام جنہوں نے خاک و
خُون میں غلطاں ہو کر ناموسِ مُصطفیٰؐ کے تحفّظ کا راز آشکار کیا ۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خُون غلطیدن
خُدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را



فہرست

عکس

ہے زندہ فقط وَحدتِ افکار سے مِلّت
وَحدت ہو فنا جس سے وہ اِلہام بھی اِلحاد

ضربِ کلیمؑ

اِن غُلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقِص ہے کتاب
کہ سِکھاتی نہیں مومن کو غُلامی کے طرِیق

'ضربِ کلیم'

پنجاب کے اربابِ نبوّت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر!

'ضربِ کلیم'

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مُسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے!

'ضربِ کلیم'

وہ نبوّت ہے مُسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوّت و شوکت کا پیام

ضربِ کلیم

؟

"ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ بانیٔ تحریک نے ملّتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دُودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دُودھ سے اور اپنے مُقلدین کو ملّتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں اُن کا بنیادی اصُولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) مُسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مُسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دُنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں ...... ملّتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مُسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے"

"اسٹیٹسمین" کے جواب میں سے ایک اقتباس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

سخن ہائے گفتنی

نہ میں ادیب ہوں، نہ مصنف، نہ مولّف۔ محض ایک طالب علم ہوں اور یہ کتاب میری اوّلین طالبعلمانہ کاوش۔ جس میں حکیم الاُمت حضرت علاّمہ اقبالؒ کی اُن تمام تحریروں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو انہوں نے قادیانیت پر نقد و نظر کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً شائع فرمائیں۔

قادیانیت محض ایک مذہبی مسئلہ ہی نہیں جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ یہ اپنے مخصوص احوال و ظروف کے پیشِ نظر ایک ایسا قومی و ملی، سیاسی و اجتماعی اور تہذیبی و معاشرتی مسئلہ ہے جو براہِ راست ہمارے آئین اور دستور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب کی غرض و غایت صرف اس قدر ہے کہ اس ملی و قومی مسئلے پر حضرت علاّمہؒ کے بصیرت افروز خیالات کا اظہار و اجتماع ہو جائے کہ آج تک کسی نے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ میری اس حقیر سعی کو قبول فرمائیں اور اس میں خیر اور افادۂ عام کا جوہر زیاد کریں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ، وَھُوَ حَسْبِیْ، وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ!

یہ مسئلہ مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کے لیے جس قدر اہمیت رکھتا ہے افسوس اس سے اُتنی ہی زیادہ بے اعتنائی برتی گئی اور مجرمانہ تغافل روا رکھا گیا۔

اس کتاب کی ترتیب کے دوران بلا مبالغہ بیسیوں کتابیں میری نظر سے گزریں، ان میں اکثر کا تعلق "اقبالیات" سے تھا مگر یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ حضرتِ علاّمہؒ کے نام پر چلنے والے اداروں نے علاّمہ مرحوم پر اب تک جتنی کتابیں شائع کی ہیں اُن میں کوئی بھی "اقبال اور قادیانیت" ایسے اہم موضوع پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جان بوجھ کر اس مسئلہ کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کے برعکس ایسی کتابیں میری نظر سے ضرور گزری ہیں جن میں قادیانی نبوت کی تعریف کا پہلو نکلتا یا قادیانیوں کے بارے میں حضرتِ علاّمہؒ کے خیالات و افکار کی غلط تعبیر ہوتی یا پھر اُن میں نقب

لگائی جاتی ہے۔ کم از کم میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہے؛ اگر اس میں قادیانی رُسوخ کو دخل ہے تو یہ بات اور زیادہ افسوسناک بلکہ شرمناک ہے اور اقبال اکادمیوں کو اس کی جرأت نہ ہونی چاہیئے۔

—— ۲ ——

یہ مجموعہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حضرتِ علامہؒ کے قلم سے ختمِ نبوت کی تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و مذہبی قدر و قیمت کا تذکرہ ہے۔ اسی باب میں حضرتِ علامہؒ کا وُہ مکتوب بھی ہے جس کا مکمل متن پہلی دفعہ منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ یہ خط اگرچہ آج سے سات برس پیشتر اقبال اکادمی کراچی کی 'انوارِ اقبال' نامی کتاب میں بھی چھپ چکا ہے مگر کتاب مذکور کے مرتب اور 'اقبال اکادمی' کراچی کے ڈائریکٹر جناب بشیر احمد ڈار نے ستم یہ ڈھایا کہ اس کا وُہ اہم ترین حصّہ ہی متن سے غائب کر دیا جس میں حضرتِ علامہؒ نے 'منکرِ ختمِ نبوت کو 'واجب القتل' قرار دیا تھا۔ مکمل متن کی اشاعت کی سعادت شاید میرے مقدر میں تھی جو اس کتاب کی ترتیب و اشاعت سے میرے حصّہ میں آئی۔ فالحمدللہ علیٰ ذالك۔

دُوسرا باب اُن مضامین و بیانات پر مشتمل ہے جو حضرتِ علامہؒ نے جُون ۳۴ء سے جنوری ۳۶ء تک قادیانیت کے رَد میں شائع فرمائے۔ اس باب کے سب سے اہم مضمون 'اسلام اور احمدیت' میں ایک تاریخی غلطی تھی جس کی حضرتِ علامہؒ ہی کے حوالے سے تصحیح کر دی گئی ہے۔ (دیکھیئے صفحہ ۱۲۰) اسی طرح ایک اور اہم سہو کی بھی اصلاح کی گئی ہے (دیکھیے صفحہ ۱۴۹)۔ 'قادیانی اور جمہور مسلمان' اور 'اسٹیٹس مین کے جواب میں' اس باب کے نہایت اہم مضامین ہیں۔ 'قادیانی اور جمہور مُسلمان' ہی میں حضرتِ علامہؒ نے فرنگی حکمرانوں سے یہ مشہورِ عام مطالبہ کیا تھا کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے ایک الگ اقلیت قرار دیا جائے۔

تیسرے باب میں علامہ مرحوم کے وُہ خطوط ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف علمی و سیاسی شخصیتوں کو لکھے۔ 'پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط' اس باب کا انتہائی اہم خط ہے۔ میری معلومات کے مطابق یہ خط خود پنڈت جواہر لال نہرو کے مرتبہ مجموعہ 'A Bunch of old letters' کے صفحہ ۱۸۱ اور عبدالمجید حریری ایم اے ایل ایل بی کے 'کچھ پُرانے خط' اُردو ترجمہ 'A Bunch of old letters' کے صفحہ ۲۹۳ پر چھپ چکا ہے۔ میں نے یہ خط جناب سیّد

عبدالواحد معینی کے انگریزی مجموعے 'Thoughts and Reflections of Iqbal' سے لیا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام حضرت علامہؒ کے خطوط بھی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہیں۔ علامہ مرحوم نے ختمِ نبوت کے موضوع پر جن شخصیتوں سے علمی استفادہ کیا اُن میں علامہ انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سرِفہرست ہیں۔ اوّل الذکر کو مرحوم دُنیائے اسلام کے جید ترین محدثین میں شمار کرتے[1] اور مؤخر الذکر کو علومِ اسلام کی جُوئے شیر کا فرہادؔ اور مولانا شبلی نعمانیؒ کے بعد اُستاذ الکل سمجھتے تھے[2]۔ ۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں مولانا ندویؒ کو لکھتے ہیں:

'میری خامیوں سے مجھے ضرور مطلع کیا کیجئے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا[3]۔'

علامہ انور شاہ کاشمیریؒ سے علامہ مرحوم کی جو مراسلت ہوئی اس کا کہیں سُراغ نہیں ملتا۔ علامہ انور شاہ صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا انظر کاشمیری یا دارالعلوم دیوبند کے مہتمم جناب قبلہ قاری محمد طیب صاحب اس سلسلہ میں کچھ سعی فرمائیں تو شاید اس خط کتابت کا بھی کچھ پتہ نشان مل جائے۔ البتہ سید سلیمان ندویؒ کے نام لکھے گئے خطوط جناب شیخ عطاء اللہ کے مرتبہ مجموعہ 'مکاتیبِ اقبال' میں موجود ہیں۔

حضرتِ علامہؒ نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۶ء تک مولانا ندویؒ کو جو خطوط لکھے ان کی اکثریت علمی سوالات و استفسارات پر مشتمل ہے۔ قادیانی ان طالبعلمانہ سوالات میں حسبِ عادت کتر بیونت کرکے اکثر انہیں اپنے اعتقادات کے سانچے میں ڈھالنے کی سعیٔ نامشکور کرتے ہیں۔ اس کھُلی ہوئی بددیانتی کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ حضرتِ علامہؒ کے استفسارات اور اُن جوابات کو

---

[1] یہ رائے حضرتِ علامہؒ نے ۱۹۲۸ء میں اورینٹل کالج لاہور کے خطبۂ صدارت میں ظاہر فرمائی۔ ملاحظہ ہو 'انوارِ اقبال' صفحہ ۲۵۵ مرتبہ بشیر احمد ڈار

[2] 'مکاتیبِ اقبال' ج ۱ صفحہ ۱۶۶ شیخ عطاء اللہ ایم اے

[3] 'مکاتیبِ اقبال' ج ۱ صفحہ ۸ شیخ عطاء اللہ ایم اے

[4] 'مکاتیبِ اقبال' ج ۱ صفحہ ۱۰۱ شیخ عطاء اللہ ایم اے

جو سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے ہیں ایک ساتھ چھاپ دیا جائے۔ یہی میں نے کیا ہے، جس سے حضرتِ علامہؒ کے خطوط کی اہمیت اور افادیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ چوتھے باب میں حضرتِ علامہؒ کے وُہ توضیحی بیانات ہیں جو اُنہوں نے مختلف سوالات کے جواب میں ارشاد فرمائے۔ اس میں 'سن رائز کے جواب میں' اور 'مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام' دو نہایت اہم تحریریں ہیں۔

حضرتِ علامہؒ کی ان چار ابواب پر مشتمل تحریروں سے پیشتر دو تین عنوانات کے تحت اِس 'گنہگار' نے بھی 'قلم درازی' کی ہے۔ پہلا عنوان ہے 'قادیانیت، تاریخی و سیاسی پس منظر' اس میں قادیانیت کے اصل مظروف کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا عنوان 'قادیانیت اور اقبال' ہے اس میں قادیانیت پر حضرتِ علامہؒ نے جو کچھ لکھا اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور چند ذیلی عنوانات کے تحت بعض ایسے حقائق و واقعات درج کئے گئے ہیں جو بجائے خود 'انکشافات' کا درجہ رکھتے ہیں۔ سب سے آخر میں 'چند شبہات اور اُن کا ازالہ' کے تحت تین قادیانی اعتراضات کا جواب شافی عرض کیا گیا ہے۔

—۳—

مجھے اس کتاب کی ترتیب میں سب سے زیادہ مدد جناب لطیف احمد شروانی کی 'حرفِ اقبال'، جناب شیخ عطاء اللہ ایم اے کی 'مکاتیبِ اقبال' اور جناب سید عبدالواحد مُعینی کے انگریزی مجموعے —'Thoughts and Reflections of Iqbal'

اقبال کے افکار و خیالات ___ سے ملی۔ جس کے لیے میں اِن فاضل مرتّبین کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ علاوہ ازیں میں اُن تمام احباب کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تدوین میں مجھ سے ذرا سا بھی تعاون کیا۔ خاص طور پر حضرتِ بشیر کنور کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے کمال محبت اور محنت سے اِس کتاب کا سرِورق تیار کیا۔ میں ریاست علی صاحب چودھری (لائبریرین اقبال لائبریری) کا بھی ممنون ہوں کہ کتابوں کے سلسلہ میں انہوں نے مجھ سے بہت تعاون کیا۔

سیالکوٹ
۱۵ مئی ۱۹۷۴ء

قادیانیت

تاریخی و سیاسی پسِ منظر

برِصغیر ہندوستان پر مسلمانوں نے قریب قریب ایک ہزار برس تک اپنے اقتدار کا پھریرا لہرایا اس سرزمین نے جہاں محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور اورنگ زیب عالمگیرؒ ایسی عظمتیں دیکھیں وہاں محمد شاہ رنگیلا ایسی پستیاں بھی مشاہدہ کیں۔ قومیں جب حد سے زیادہ عروج حاصل کر لیتی ہیں تو پھر اُن کا زوال قریب آجاتا ہے۔ اورنگ زیب کے بعد مغلوں کے ساتھ یہی ہوا اور انگریز جو تاجروں کا رُوپ دھار کر اغلباً جہانگیر کے عہد میں ہندوستان وارد ہوئے تھے اُن کا اقتدار بڑھتا گیا۔ انگریزوں کی ابلیسی سیاست کی ایک دُنیا مُعترف ہے۔ یہ قوم اپنی اس 'خوبی' کی بدولت خاصی مشہور بھی ہوئی، اور خاصی بدنام بھی۔ مصر کے مرحوم صدر جمال عبدالناصر نے کیا خوب کہا ہے کہ دریائے قُلزم کی پہنائیوں میں اگر دو مچھلیاں بھی آپس میں لڑتی ہیں تو باور کیجیے اس میں بھی انگریزی سیاست کارفرما ہوگی۔ میرے خیال میں صدر ناصر نے اس تمثیل میں انگریزوں کی Divide and Rule کی مکرُوہ پالیسی کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ اور بڑے بلیغ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انگریز کی 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی اِس پالیسی نے بڑی بڑی سلطنتوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ مسلمان خاص طور پر اُس کی سازشوں کا نشانہ بنے کہ اُس کی ازلی و ابدی اسلام دُشمنی یہی چاہتی تھی۔ آج مسلمان ملکوں کا دُنیا کے نقشہ پر مطالعہ کیجیے، آپ دیکھیں گے کہ پاکستان سے الجزائر و سوڈان تک تمام مسلمان ملک ایک دوسرے سے کس طرح مربُوط و منسلک ہیں، مگر کیا وجہ ہے کہ اس تمام تر جغرافیائی پیوستگی اور نظریاتی وابستگی کے باوجود برسہا برس سے یہ سب باہم کٹے پھٹے اور جُدا جُدا ہیں، عملاً ابھی تک ایک نہیں ہو سکے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب فرنگی سیاست کے برگ و بار اور مسلمانوں کی سادہ لوحی کا نتیجہ ہے۔ انگریز جانتا تھا (اور مغربی استعمار بلکہ ہر قسم کے استعمار کی سوچ اب بھی یہی ہے) کہ اگر

مسلمانوں میں نظریاتی و جغرافیائی اتحاد کے ساتھ ساتھ سیاسی اتحاد بھی ہو گیا تو یہ کتنی بڑی طاقت بن جائیں گے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مسلمان دُنیا میں سمٹنے کے لیے نہیں، پھیلنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اُس کے برٹش ایمپائر کے سنہرے و توسیع پسندانہ خواب کی تعبیر میں دُنیائے اسلام ایک بڑی بلکہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اُس نے یہ سب کچھ سامنے رکھ کر مسلمانوں کو فنا کرنے کی تدابیر سوچیں اور اپنی طے شدہ پالیسی کے مطابق فیصلہ کیا کہ مسلمانوں میں انتشار پسند اور حریص عناصر کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں اندر سے کھوکھلا کیا اور مختلف گروہوں میں بانٹا جائے۔ ان کے درمیان ایسے مسائل اور ایسی تحریکیں پیدا کی جائیں کہ وُہ کبھی ایک عظیم طاقت بن کر نہ اُبھر سکیں۔ سلطنتِ عثمانی کی شکست و ریخت ہو یا چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کا قیام، اعلانِ بالفور ہو یا ریڈ کلف ایوارڈ، ایران کا بہائی فتنہ ہو یا ہندوستان کا قادیانی فتنہ، اُس نے وہی چال چلی اور وہی مہرے چُنے جن میں اُس کا فائدہ اور مسلمانوں کا نقصان زیادہ سے زیادہ تھا۔

سلطان ٹیپو ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری اُمید تھا اور اُس نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو واپس لانے کی خاطر بڑی بہادری سے جنگیں لڑیں مگر اس کی شہادت کے ساتھ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور روما کی عظمت کا چراغ گل ہو گیا، اور نتیجتہً انگریزی استبداد کا دیو بوتل کے جن کی طرح کھُل کر سامنے آگیا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان پر انگریز تاجروں کی حکومت تھی اور وُہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے لوٹ کھسوٹ کر رہے تھے۔ بظاہر اُن کے لیے خطرے کی کوئی بات نہ تھی مگر ۱۸۳۱ء میں سیّد احمد شہیدؒ کی تحریکِ جہاد نے اُن کے کان کھڑے کر دیئے، ابھی اس تحریک کے اثرات و نتائج کو وُہ زائل نہ کر سکے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں اُن پر براہِ راست وار ہو گیا۔ دہلی، لکھنؤ، میرٹھ، کانپور، اودھ، روہیل کھنڈ، بندھیل کھنڈ اور گوالیار انگریزوں کے خلاف آتش فشاں بن گئے۔ اگرچہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ میں جان نہ تھی تاہم اُس کا نام ہندوستان بھر میں گونجنے لگا۔ انگریزوں کے لیے یہ بڑا کٹھن وقت تھا اور اگر اس وقت انہیں ہندوستان کے غدارانِ ازلی کا تعاون حاصل نہ ہو جاتا اور مسلمان اور ہندو باہم سوچ سمجھ کر جنگ کرتے اور اتحادِ عمل کا ثبوت دیتے تو انگریزی اقتدار کی بساط اُلٹی جا چکی تھی۔ مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا۔

مسلمان اور آزادی پسند ہندو آج بھی اس لڑائی کو جدوجہدِ آزادی کے نام سے یاد کرتے

اور اُن کے سر اس کے شہدا کے لیے احترام کے ساتھ جُھک جاتے ہیں۔ مگر انگریز اور اس کے زَلّہ رُبا اس کو غدر، ایسا غیر حقیقت پسندانہ خطاب دیتے ہیں ——— بہرحال اس لڑائی کے بعد اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کی بجائے تاجِ برطانیہ کے ماتحت ہوگیا۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شکاری دھوکے کی ٹَٹّی سے باہر نکل آئے۔ انگریزوں نے اقتدار کی عنان چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی تھی، اس لیے وُہ زیادہ خائف و بدگمان بھی انہی سے تھے۔ اس جنگ نے اُن کے اس تاثر کو اور گہرا کیا۔ اب معاملہ چونکہ تاجِ برطانیہ کے وقار و استحکام کا ہوگیا تھا۔ اس لیے انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا وُہ افسوسناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ یہ ہندوستان میں مسلمانوں کی انتہائی مظلومی کے دِن تھے انگریزوں کے مظالم دیکھ کر ہندوستان کا ذرہ ذرہ اشکبار ہوگیا۔ اُداسی نے بال بکھیرے، آنسوؤں نے ہالا بُنا، آہوں نے دم توڑا، سسکیاں ہچکیوں میں بدلیں، شاہ گدا ہوئے، شاہزادوں کی گردن کٹی، عورتیں کھلونا بنیں، اپنے بیگانے ہوئے، بیگانے یگانے ہوئے، ہندوستان نے پھر ایک ٹیپو سلطان دیکھا اور ٹیپو نے میر صادق۔ وقت بدلا کردار وہی رہے۔

یوں گویا پورا ہندوستان مظلوم و مجبور بہادر شاہ کی اُس مشہور غزل کی صدائے بازگشت بن گیا۔ جس کا مطلع ہے ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں، نہ کسی کے دِل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وُہ ایک مُشتِ غُبار ہوں

مسلمانوں کی وحدت و اخوت اور انہیں برقِ تپاں بنانے والے جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کی خاطر انگریزوں نے ہر حربہ استعمال کیا۔ ہندوستانی علمار قافلۂ حریت و جہاد کے جگردار سپاہی تھے۔ انگریز نے سب سے پہلا وار انہیں پر کیا۔ یہ میرا موضوع نہیں، ورنہ میں بتاتا کہ انگریزی کربلا میں ان عُلمار پر کیا گزری؟ مسلمانوں کی شمشیر زن قوم کو ٹھنڈی لاش بنانے کے لیے انگریزوں کو مسلمانوں کے اندر ہر شعبۂ حیات میں ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو اس کے وفادار ہوں اور اس کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی شیطانی پالیسی میں مُمِد و معاون ثابت ہوسکیں۔

قومیں جب اپنے دورِ انحطاط میں ہوتی ہیں تو اُن میں فروختنی مال بڑھ جاتا ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا تھا۔ انگریز کو ہر قسم کے لوگ میسر آگئے۔ اِدھر یہ مسئلہ حل ہوا اُدھر عیسائی پادریوں نے ہلّا بول دیا۔

ہندوستان کے مسلمان کو مذہب کا پرستار دیکھ کر انگریز نے کمال چالاکی سے مناظروں اور مباحثوں کا دُھندہ رچا دیا۔ پہلے مسلمانوں اور عیسائیوں، پھر عیسائیوں اور ہندوؤں اور پھر مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین بحث مباحثے کا میدان گرم ہوا اور سب سے آخر میں مسلمان، مسلمان سے بھڑ گئے۔ پہلے صداقتِ مذاہب بحث کا موضوع تھی، اب امکانِ نظیر اور امتناعِ نظیر ایسے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ایسے مردِ مجاہد پر کُفر کا آرا چل گیا، جس نے اپنی جان تک راہِ حق میں لُٹا دی اور اپنے پاک خُون سے بالاکوٹ کی سرزمین کو لالہ زار کیا تھا۔ یُوں وہابی سُنی کشمکش پیدا Create کی گئی۔ 'ہندو مُسلم' امتیاز و نزاع پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ مگر ان تمام تر مذہبی مناقشات اور داخلی کشمکش کے باوصف بھی جذبۂ جہاد کی چنگاری اپنی لَو دے جاتی اور اسی سے انگریز کی جان جاتی تھی۔ انگریز مصنفین نے برِصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی لگاتار کامیابیوں کے جو اسباب گنوائے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ :

> "مسلمانوں میں دینی سرگرمی بھی کام کرتی تھی کہتے تھے کہ فتح پائی تو غازی مرد کہلائے حکومت حاصل کی، مر گئے تو شہید بنے، اس لیئے مرنا یا مار ڈالنا بہتر ہے اور بیٹھ دکھانا بیکار[1]"

معلوم نہیں اس بات میں کہاں تک صداقت ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک مطبوعہ برطانوی دستاویز 'The Arrival of British Empire in India' میں درج ہے کہ

> "۱۸۶۹ء میں انگلینڈ سے برطانوی مدبّروں اور مسیحی رہنماؤں کا ایک وفد اس بات کا جائزہ لینے کے لیئے ہندوستان پہنچا کہ ہندوستانی باشندوں میں برطانوی سلطنت سے وفاداری کا بیج کیوں کر بویا جا سکتا اور مسلمانوں کو رام کرنے کی صحیح ترکیب کیا ہو سکتی ہے؟......
> اس وفد نے ۱۸۷۰ء میں دو رپورٹیں پیش کیں جن میں کہا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے رُوحانی راہنماؤں کی اندھا دھند پیروکار ہے اگر اس وقت ہمیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اپاسٹالک پرافٹ (حواری نبی) ہونے کا دعوٰی کرے تو بہت سے لوگ اُس کے

---

[1] 'تاریخ برطانوی ہند' صفحہ ۳۰۲ مطبوعہ ۱۹۳۵ء

گرد اکٹھے ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں میں ایسے کسی شخص کو ترغیب دینا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو پھر ایسے شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں بطریق احسن پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ اب کہ ہم پورے ہندوستان پر قابض ہیں تو ہمیں ہندوستانی عوام اور مسلمان جمہور کی داخلی بے چینی اور باہمی انتشار کو ہوا دینے کے لیے اسی قسم کے عمل کی ضرورت ہے[1]۔

اصل کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری بہر حال واقعات کا تسلسل بتاتا ہے کہ مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت اور تنسیخ جہاد کے اعلان نے ایک اہم برطانوی ضرورت کو پورا کیا۔ بقول حضرت علامہؒ قادیانی تحریک فرنگی انتداب کے حق میں الہامی سند بن کر سامنے آئی[2] اور بچارے مسلمان پچاس سال تک اسی فتنہ کو فرو کرنے میں لگے رہے۔ قادیانیت کے اس کردار کا اعتراف خود اس کے بانی نے بڑے کھلے لفظوں میں اور بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اپنی ایک کتاب 'تریاق القلوب' میں ایک مقام پر وہ لکھتا ہے:

> 'میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں[3]'

'ستارہ قیصرہ' میں لکھا ہے:

> 'مجھ سے سرکارِ انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے بلادِ اسلام میں اس مضمون کے شائع کئے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے

---

[1] 'عجمی اسرائیل' صفحہ ۱۹ مرتبہ آغا شورش کاشمیری

[2] 'حرفِ اقبال'، صفحہ ۱۴۳ لطیف احمد شروانی، ایم اے

[3] 'تریاق القلوب' صفحہ ۱۵ مرزا غلام احمد قادیانی مطبوعہ ۱۹۰۲ء

اس دولت کا شکرگزار اور دُعاگو رہے اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اُردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں اور یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں مکّے اور مدینہ میں بھی بخوشی شائع کر دیں اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور بلادِ شام اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا اشاعت کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وُہ غلیظ خیالات چھوڑ دیئے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکا۔[1]

"آج کی تاریخ تک تیس ہزار کے قریب یا کچھ زیادہ میرے ساتھ جماعت ہے جو برٹش انڈیا کے متفرق مقامات میں آباد ہے اور ہر شخص جو میری بیعت کرتا ہے اور مجھ کو مسیح موعود مانتا ہے اسی روز سے اس کو یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں جہاد قطعاً حرام ہے۔ کیونکہ مسیح آچکا خاص کر میری تعلیم کے لحاظ سے اس گورنمنٹ انگریزی کا سچا خیر خواہ اس کو بننا پڑتا ہے۔"[2]

"میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیوں کہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔"[3]

اور اسی کتاب میں ذرا آگے چل کر بالفاظِ صریح اپنی جماعت کو انگریز کا "خود کاشتہ پودا" قرار دیا ہے۔[4] بانیٔ قادیانیت کے خاندانی حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریز کا پُرانا نمک خوار و وفادار خاندان تھا۔ مرزا غلام احمد کے اپنے الفاظ میں:

---

[1] "ستارہ قیصرہ" ص ۸ مرزا غلام احمد قادیانی۔

[2] "گورنمنٹ انگریزی اور جہاد" ضمیمہ ص ۸ مرزا غلام احمد قادیانی۔

[3] "تبلیغِ رسالت"، ج ۷، ص ۱۷ مرزا غلام احمد قادیانی [4] "تبلیغِ رسالت"، ج ۷، ص ۱۹ مرزا غلام احمد قادیانی

"میں ایک ایسے خاندان سے ہوں کہ جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد میرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں ایک وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا جن کو دربارِ گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسانِ پنجاب میں ہے۔ اور ۱۸۵۷ء میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکارِ انگریزی کو مدد دی تھی۔ یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکارِ انگریزی کی امداد میں دیئے تھے۔[1]"

اس کے بعد مرزا غلام احمد نے اُن خطوط کا تذکرہ کیا ہے جو انگریزی حکام نے وقتاً فوقتاً اُن کے باپ اور بڑے بھائی میرزا غلام قادر کو اپنی خوشنودی کے اظہار اور اُن کی 'خدمات' کے اعتراف کے طور پر لکھے، چونکہ ان خطوط سے مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کے انگریزوں کے ساتھ مخصوص تعلقات' پر روشنی پڑتی اور یہ ایک دستاویزی ثبوت ہے اس لیئے میں اُن کا فوٹو سٹیٹ چھاپ کر اس دستاویزی ثبوت کو ہمیشہ کے لیئے محفوظ کر رہا ہوں۔ خطوط یہ ہیں:

۱—

مسٹر وِلسن بنام مرزا غُلام مرتضیٰ رئیسِ قادیان

میں نے آپ کی اُس درخواست کا بغور مطالعہ کیا ہے جس میں آپ نے اپنی اور اپنے خاندان کی خدمات اور اس کے حقوق کی یاد دہانی کرائی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں، بلاشبہ آپ اور آپ کا خاندان سرکارِ انگریزی کا جانثار، وفادار اور ثابت قدم خدمتگار رہا ہے۔ اور

[1] اشتہار واجب الاظہار، منسلک، کتاب البریہ، صہ۳ مرزا غلام احمد قادیانی

آپ کے حقوق یقیناً لائقِ توجہ ہیں۔ آپ بہر نوع تسلی وتشفی رکھیں ۔ برٹش گورنمنٹ آپ کے خاندان کے حقوق وخدمات کو ہرگز فراموش نہ کرے گی اور جیسے ہی کوئی مناسب موقع نکلا ان پر پوری توجہ دی جائے گی۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ بدستور حکومت کے جانثار و وفادار رہیں کہ حکومت کی خوشنودی اور آپ کی بہبودی کا راز یہی ہے۔

المرقوم ۱۱ر جون ۱۸۴۹ء لاہور

۲

مسٹر رابرٹ کسٹ، بنام مرزا غلام مرتضیٰ رئیسِ قادیان

آپ نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران سوار اور گھوڑے مہیا کرکے سرکارِ دولتمدار کی جو خدمت کی اور اس کے آغاز سے اب تک جس طرح اپنی وفاداری کو برقرار رکھا اور خوشنودئ سرکار حاصل کی۔ اس کے اعتراف و اظہار کے طور پر مبلغ دوصد روپیہ کا خلعت، آپ کو عطا کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں چیف کمشنر کے مراسلہ نمبر ۵۷۶ مورخہ ۱۰ر اگست ۱۸۵۸ء میں ظاہر کی گئی خواہش کے مطابق پروانہ ہٰذا آپ کی وفاداری ونیک نامی پر حکومت کے اعتماد کو ظاہر کرنے کے لیئے آپ کے نام روانہ کیا جاتا ہے۔

مرقومہ ۲۰ر ستمبر ۱۸۵۸ء

You must continue to be faith-
-ful and devoted subjects as in
it lies the satisfaction of the Govt.
and your welfare.

11-6-1849 Lahore.

Translation of Mr Robert Cast's
Certificate.

To

Mirza Ghulam Murtaza
Khan chief of Qadian.

As you rendered great help in
enlisting Sowars & supplying
horses to Govt in the mutiny
of 1857 and maintained loyal-
-ty since its beginning up to
date and thereby gained the
favor of Govt a *Khilat* worth
Rs 200/- is presented to you in
recognition of good services

نقل مراسلہ

(رابرٹ کسٹ صاحب بہادر کمشنر لاہور)

تہور و شجاعت دستگاہ مرزا غلام مُرتضےٰ
رئیس قادیاں بعافیت باشند۔

ازانجاکہ ہنگام مفسدہ ہندوستان موقوعہ
۱۸۵۷ء از جانب آپکے رفاقت و خیرخواہی
و مدد دہی سرکار دولتمدار انگلشیہ درباب
نگاہداشت سواران و بہمرسانی اسپان
بخوبی بمنصہ ظہور پہونچی اور شروع مفسدہ
سے آجتک آپ بدل ہوا خواہ سرکار
رہے اور باعث خوشنودی سرکار ہوا
لہذا بجلدوی اس خیرخواہی و خیرسگالی
کے خلعت مبلغ دو صد روپیہ کا سرکار سے
آپ کو عطا ہوتا ہے اور حسب منشاء چٹھی

مسٹر رابرٹ کسٹ کا خط مرزا غلام مُرتضیٰ کے نام

صاحب چیف کمشنر بہادر نمبری ۵۷۶ مورخہ ۱۰ اگست ۱۸۵۸ء پروانہ ہذا باظہار خوشنودی سرکار و نیکنامی و وفاداری بنام آپکے لکھا جاتا ہے۔

مرقومہ تاریخ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

نقل مراسلہ فنانشل کمشنر پنجاب

مشفق مہربان دوستان مرزا غلام قادر رئیس قادیان حفظہٗ۔

آپکا خط ۲ ماہ حال کا لکھا ہوا ملاحظہ حضور اینجانب میں گذرا مرزا غلام مرتضےٰ صاحب آپکے والد کی وفات سے ہمکو بہت افسوس ہوا مرزا غلام مرتضےٰ سرکار انگریزی کا اچھا خیرخواہ اور وفادار رئیس تھا ہم آپکی خاندانی لحاظ سے اسیطرح عزت کرینگے جسطرح تمہارے باپ وفادار کی کیجاتی تھی ہمکو کسی اچھے موقعہ کے نکلنے پر تمہارے خاندان کی بہتری اور پابجائی کا خیال رہیگا۔

المرقوم ۲۹ جون ۱۸۷۶ء

الراقم سر رابرٹ ایجرٹن صاحب بہادر فنانشل کمشنر پنجاب

and as a reward for your t[illegible]

Moreover in accordance [illegible] the wishes of chief Commission as conveyed in his no 576 d/ 10th August 58 this parwana is addressed to you as a token of satisfaction of Govt for your fedelity and repute.

Translation of sur Robert Egerton Financial Commrs Murasla d/ 29 June 1876

My dear friend Ghulam Qadir

I have perused your letter of the 2nd instant & deeply regret the death of your father Mirza Gulam Murteza who was a great well wisher and faithful chief of Govt.

In consideration of your family services I will esteem you with the same respect as that bestowed on your loyal father. I will keep in mind the restoration & welfare of your family when a favorable opportunity occurs.

فنانشل کمشنر پنجاب سر رابرٹ ایجرٹن کا مرزا غلام قادر کے نام خط

۳—

سر رابرٹ ایجرٹن فنانشل کمشنر پنجاب
بنام
مرزا غلام قادر ولد مرزا غلام مُرتضیٰ رئیسِ قادیان

میرے پیارے دوست غلام قادر!

میں نے آپ کا خط جو اس ماہ کی ۲ تاریخ کا لکھا ہوا ہے، پڑھا۔ مجھے آپ کے باپ — مرزا غلام مُرتضیٰ کی وفات کا ازحد افسوس ہوا۔ وُہ سرکارِ انگریزی کے اچھے خیر خواہ اور وفادار رئیس تھے۔ ہم آپ کی خاندانی لحاظ سے اسی طرح عزّت کریں گے جس طرح آپ کے وفادار والد کی کیجاتی تھی۔ کوئی مناسب موقع نکلنے پر ہمیں آپ کے خاندان کی بہتری اور پابجائی کا خیال رہے گا۔

المرقوم ۲۹ رجُون ۱۸۷۶ء

---

٥ محوّلہ خطوط میرزا غلام احمد کی تصنیف "کتاب البریّہ" سے منسلک "اشتہار واجب الاظہار" کے صفحہ ۴، ۵ اور ۶ سے نقل کیے گئے ہیں۔ مرتّب

—— اِن خطوط کے تذکرہ کے بعد مرزا قادیانی لکھتے ہیں :

"پھر میرے والد صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی میرزا غلام قادر خدماتِ سرکاری میں مصروف رہا اور جب تمو کی رہگزر پر مفسدوں کا سرکارِ انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وُہ سرکارِ انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک ہوئے[1]"

اور یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دُنیائے اسلام پر جب کبھی کوئی اُفتاد پڑی اُس اسلام دُشمن جماعت نے گھی کے چراغ جلائے اور یہ بات تو جسٹس منیر نے بھی جنہیں اُن کی جانبدارانہ رپورٹ کے باعث عام طور پر کچھ زیادہ اچھا نہیں سمجھا جاتا، ریکارڈ کی ہے کہ :

"جب پہلی جنگِ عظیم میں جس میں ترکوں کو شکست ہو گئی تھی بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو قادیان میں اس 'فتح' پر 'جشنِ مسرت' منایا گیا[2]"

یہ بات بھی جسٹس منیر ہی نے لکھی ہے کہ بانئ قادیانیت نے اسلامی ممالک کا انگریزی حکومت کے ساتھ توہین آمیز انداز میں مقابلہ و موازنہ کیا[3]

ملاحظہ فرمایا آپ نے ؟ —— بانئ قادیانیت نے ممانعتِ جہاد اور اطاعتِ انگریزی پر مبنی ہزارہا کتابیں لکھیں، اُنہیں بلادِ اسلام میں پھیلایا، انگریزی اقتدار کے بقا و استحکام کی دُعائیں کیں، اسے مسلمان حکومتوں سے افضل ٹھہرایا، دُنیائے اسلام کی شکست و ریخت پر مسرت کے شادیانے بجائے اور . . . . اور وُہ سب کچھ کیا جو اسلام اور مسلمانوں کی ایک غدار اور مغربی استعمار کی ایجنٹ و آلۂ کار جماعت ہی کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز جہاں جہاں گیا اُس نے اس تحریک کی آبیاری کی۔ افریقہ دُنیا کا وُہ واحد برِاعظم ہے جس کا پنڈ برٹش ایمپائر نے سب سے بعد میں چھوڑا اور جہاں ابھی تک کچھ علاقے برطانوی اثرات کے تابع ہیں۔ اور قارئین کو یہ

---

[1] "اشتہار واجب الاظہار ص۵ منسلک کتاب البریّہ"، مرزا غلام احمد قادیانی

[2] "تحقیقاتی رپورٹ"، ص۲۰۹، مرتبہ جسٹس محمد منیر

[3] "تحقیقاتی رپورٹ"، ص۲۱۰ مرتبہ جسٹس محمد منیر

جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ یہیں قادیانی تحریک کے پاؤں سب سے زیادہ مضبوط ہیں۔ حتیٰ کہ ایک افریقی ملک کا سربراہ تک قادیانی گورکھ دھندے میں اُلجھا ہوا ہے۔ حال ہی میں قادیانیوں نے 'افریقہ سپیکس' 'Africa Speaks' کے نام سے اپنی جماعت کے موجودہ سربراہ مرزا ناصر احمد (پوتا مرزا غلام احمد قادیانی) کے دورۂ افریقہ کی جو رُوداد چھاپی ہے وہ افریقہ میں قادیانی اثر و نفوذ کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں یہ عبارت قابلِ غور ہے :

'One of the main points of Ghulam Ahmad's has been its rejection of "Holy Wars" and forcible conversion.'[1]

کہ غلام احمد کے بڑے معتقدات میں سے ایک 'مقدس جنگ' (جہاد) اور بالجبر عقیدہ منوانے کا انکار ہے۔ اس عبارت پر اس کے سوا کیا تبصرہ کیا جائے کہ اگر افریقہ ابھی تک مکمل طور پر فرنگی شاطروں کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل نہیں کر سکا تو اس کی ایک وجہ اسلام اور دُنیائے اسلام کی یہ غدار جماعت ہے۔ پاکستان کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات نہیں، دونوں ایک دوسرے کی آنکھ کا کانٹا ہیں مگر قادیانی مشن ہے کہ وہاں قائم ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے مابین اب تک تین جنگیں ہوئیں۔ قادیان عین پاک بھارت سرحد پر واقع ہے ہندوستان نے اُن ۳۱۳ قادیانی درویشوں کو جو قادیان میں رہائش پذیر ہیں اور جن کا ربوہ سے باقاعدہ رابطہ ہے ہمیشہ قادیان ہی میں رہنے دیا، اس خصوصی رعایت کا سبب؟ حجاز میں قادیانیوں کے لیے جگہ نہیں، مصر ان کا وجود گوارا نہیں کرتا، شام میں ان کے خلاف ایکشن ہوا، ترکی انہیں ناپسند کرتا ہے، افغانستان انہیں سنگسار کر چکا۔ ——— خود پاکستان کا مسلمان ان کے خلاف ہے اور سخت خلاف، ۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف تمام ملک میں زبردست ایجی ٹیشن ہوا اور سینکڑوں مسلمانوں نے مطالبات منوانے کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ حال ہی میں مکہ معظمہ میں رابطۂ اسلامی

---

[1] 'Africa Speaks' Page 93. Published by Majlis Nusrat Jahan Tahrik-i-Jadid, Rabwah.

ے زیرِ اہتمام دُنیا بھر کی ایک سو سے زائد اسلامی تنظیموں نے قادیانیوں کے خلاف اپنے شدید ردِ عمل اور برہمی کا اظہار کیا ہے۔ آخر اس تمام تر نفرت کا سبب؟ ظاہر ہے یہ قادیانیوں کا سازشی کردار ہی ہے جو انہیں دُنیائے اسلام میں اس نفرت و حقارت کا نشانہ بنواتا ہے۔ اگر وُہ مغربی استعمار کی ایجنٹی اور اسلام و عالمِ اسلام کی شکست و ریخت سے باز آجائیں تو پھر ان کے خلاف احتجاج کیوں ہو؟ - - - - - - - - - - - - اور یہی قادیانیت کا تاریخی و سیاسی پسِ منظر ہے۔

شاید میں اس قدر طویل پسِ منظر، جسے مرزا غلام احمد کی تحریروں نے اور زیادہ بوجھل کر دیا ہے نہ لکھتا مگر گزارشِ احوالِ واقعی اور 'The Arrival of British Empire in India' کی روایت کی تنقیح کی خاطر یہ ناگزیر سا معلوم ہوا۔ بہرحال میں نے قارئین کے سامنے دستاویزی شواہد کے ساتھ حقائق و واقعات کا آئینہ رکھ دیا ہے قادیانیت کے حقیقی خدوخال کا تعین وُہ خود کر سکتے ہیں۔

قادیانیت اور اقبال

قادیانی جماعت نے برِصغیر پاک و ہند کے اندر اور باہر جس برطانوی ضرورت کو پورا کیا اور دُنیائے اسلام کو جس قدر نقصان پہنچایا اس کا حال پیچھے گزر چکا ہے۔ ظاہر ہے مُسلمان اپنی حیاتِ اجتماعی پر کلہاڑا کیسے چلنے دیتے؟ ختمِ نبوت ایسے اصولِ اتحاد کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے کی اجازت دینے کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے۔ یہ ناممکن تھا۔ چنانچہ انگریز کی ساختہ و پرداختہ اس جماعت کا تعاقب ہوا اور خوب ہوا۔

قادیانیت کے خطّ و خال واضع کرنے اور اس کے مضرات کی نشاندہی میں اگرچہ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، چودھری افضل حقؒ، سید ابوالحسن علی ندوی، الیاس برنی اور سر ظفر علی وغیرہ مشاہیر و اکابر نے بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں مگر قادیانیت کو نقد و نظر کے ترازو میں جس طرح شاعرِ مشرق، حکیم اُمت اور مصورِ پاکستان اقبالؒ نے تولا واقعہ یہ ہے کہ یہ انہی کا حق تھا - - - - - - - یہ الگ بات کہ آج اُن کی تصویر — پاکستان — میں یہ رنگ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

نظریۂ خاتمیت کو جدید رنگ میں پیش کرنے کا شرف سب سے پہلے حضرتِ علامہؒ ہی کو حاصل ہوا انہوں نے قادیانیت کو نہ صرف ہندوستان میں بے نقاب کیا بلکہ یورپ میں بھی اس کے خلاف آواز سب سے پہلے حضرتِ علامہؒ ہی نے اُٹھائی۔

ختمِ نبوت کا مسئلہ مسلمانوں کے دل و دماغ کا مسئلہ ہے۔ اور اس کے لیے مسلمان شروع ہی سے بڑا احساس رہا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی نسبت امام موفق بن احمد المکیؒ لکھتے ہیں کہ اُن کے زمانہ میں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے سچا ہونے کی نشانیاں دکھلانے کی خاطر مہلت چاہی، امام صاحبؒ نے سُنا تو فرمایا، جس کسی نے اس متنبی سے کوئی علامت طلب کی کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس طرح نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہُ اُمّی و اَبی) کے فرمان لَا نَبِیَّ بَعدِی (میرے بعد کوئی

نبی نہیں) کی تکذیب لازم آتی ہے[1]۔ امام المورخین علامہ ابنِ خلدون کے مطابق مسلمانوں میں سب سے پہلا اجماع اسی نظریہ کے تحفظ پر ہوا[2] اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں سینکڑوں صحابہؓ و تابعینؒ نے جن کی اکثریت حفاظِ قرآن پر مشتمل تھی، اپنے مقدس خون کا نذرانہ دے کر اس پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ" اور "سرِ وحدتِ ملت" کی محافظت کا فرض ادا کیا[3]

ع یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

حضرتِ علامہؒ بلاشبہ اس دور کے ایک عظیم مسلمان مفکر و فلسفی تھے —— تاریخِ اسلام اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر اُن کی گہری نظر تھی اور وُہ خوب جانتے تھے کہ قوموں کا شیرازہ کیسے مجتمع ہوتا اور کیونکر بکھر جاتا ہے؟ اُن کے نزدیک اسلامی وحدت دو چیزوں سے عبارت تھی (۱) توحید (ب) ختمِ نبوت اور بقول اُن کے:

"دراصل عقیدۂ ختمِ نبوت ہی وُہ حقیقت ہے جو مُسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لیئے فیصلہ کُن کہ (فلاں) فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں؟[4]"

چنانچہ جب مفردِ قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں" کا نغمہ الاپنے اور "لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" کو "حفظِ سرِّ وحدتِ ملت" ازد بتانے والے نے قادیانیت کا بغور مطالعہ و تجزیہ کیا تو بے ساختہ پکار اُٹھا:

'I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India'[5]

---

[1] "مناقبِ موفق" ج ۱ صـ ۱۶۱ مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

[2] "خاتم النبیین" صـ ۳۳ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ طبری" "البدایہ والنہایہ" اور "تاریخ ابن خلدون"

[4] "حرفِ اقبالؒ" صـ ۱۲۷ لطیف احمد شروانی

[5] Thoughts and Reflections of Iqbal' Page 306. By Syed Abdul Wahid

کرمیں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان (جب ہندوستان ایک تھا) دونوں کے غدار ہیں اور ببانگِ دہل یہ مطالبہ کردیا کہ:

"حکومت قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا جیسی وُہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے[1]"

اور کہا:

"ملّتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے[2]"

اگر اقتدار حضرتِ علامہؒ کے ہاتھ میں ہوتا تو وُہ قادیانیت کو آئینی احتساب کے شکنجے میں یوں جکڑتے کہ وُہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتی۔ اور یہ تو امرِ واقعہ ہے کہ جہاں جہاں اُن کا بس چلا، اُنہوں نے جکڑا بھی۔ انجمن حمایتِ اسلام کا ریکارڈ گواہ ہے کہ اُس کے مرزائی ارکان کو جب تک بھرے اجلاس سے نکلوا نہ دیا کرسیٔ صدارت پر تشریف فرما نہ ہوئے[3] اور جب بقول عاشق حسین بٹالوی احرار کے اصرار پر مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ نے اپنے حلف نامے میں یہ شق رکھی کہ:

"میں اقرارِ صالح کرتا ہوں اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دیئے جانے کے لیئے انتہائی کوشش کروں گا[4]"

---

[1] 'حرفِ اقبال'، ص ۱۱۹ لطیف احمد شروانی ایم اے

[2] 'حرفِ اقبال'، ص ۱۲۹ لطیف احمد شروانی، ایم اے

[3] 'چٹان'، لاہور ص ۴ ۲۴ر جولائی ۱۹۶۷ء

[4] 'اقبال کے آخری دو سال'، ص ۳۴۱ عاشق حسین بٹالوی

تو حضرتِ علامہؒ نے بحیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ اس کی توثیق فرما کر قادیانیت کو سیاسی سطح پر ایک اور ضربِ کاری لگائی ○ سچ تو یہ ہے کہ حضرتِ علامہؒ قادیانیت سے اس درجہ نفرت کرنے لگ گئے تھے کہ اُن کے نزدیک اس سے بڑا معاشرتی ناسُور کوئی نہ تھا۔ یہ ۱۹۳۰ء یا اس سے کچھ پہلے کی بات ہے[1] حضرتِ علامہؒ کے بڑے بھائی (شیخ عطا محمد صاحب) نے اپنی ایک لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں اُن سے ایک رشتہ کا ذکر کیا اور اُن کی رائے دریافت کی، لڑکا اور اُس کے والدین ختمِ نبوت کے منکرین میں سے تھے، آپ نے جواب دیا:

'بھائی صاحب! اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو میں ہرگز ہرگز یہاں شادی نہ کرتا'

یہ بھی حضرتِ علامہؒ کی دینی حمیت، ملی غیرت اور سیاسی بصیرت۔ حیرت ہے اس کے باوجود اقبال کے نام پر روٹیاں توڑنے والے بزرجمہر قادیانیت کے بارے میں مداہنت کرتے، سیاسی جماعتیں پہلو بچاتیں اور لیڈر کنی کتراتے ہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے:

'علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خودغرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں'[2]

○ اگرچہ 'اقبال کے آخری دو سال' کے مؤلف نے اس تاریخی حقیقت کو مسخ کر کے قادیانیت کو سپورٹ Support کرنے کی بے حد کوشش کی ہے مگر بات بنی نہیں۔ عاشق حسین بٹالوی ہوں یا عبدالمجید سالک، حضرت مرشؔ ہوں یا کوئی اور —— کسی میں اتنا بوتا نہیں کہ قادیانیوں کو مسلمانوں میں شامل کر سکے۔ مرتب۔

[1] '۱۹۳۰ء یا اس سے کچھ پہلے کی بات ہے' —— یہ بات میرے استفسار پر جناب خالد نظیر صاحب صُوفی (مرتب: 'اقبال درونِ خانہ') نے اپنی والدہ محترمہ مدظلہا سے پوچھ کر مجھے بتائی۔ صُوفی صاحب کی والدہ زید مجدہا شیخ عطا محمد صاحب (برادرِ اکبر حضرت علامہؒ) کی سب سے چھوٹی دُختر ہیں۔ اور جس لڑکی کی شادی کا ذکر ہے وُہ موصوفہ سے کوئی دو تین برس بڑی تھیں۔ مرتب۔

[2] چودہری نیاز علی کے نام خط ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء، مندرج 'مکاتیبِ اقبالؒ' ج ا ص۲۵۱ شیخ عطاءاللہ

قادیانی اکثر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان کا جنونی مسلمان مذہب کے پردے میں اُن کے مال وجان اور آبرو کا درپے ہے۔ لیکن یہ درست نہیں، قادیانیوں کا واویلا صرف اس لیئے ہے کہ وُہ احتساب سے بچے رہیں۔ مگر حضرتِ علامہؒ کے افکار و خیالات کی روشنی میں مَیں یہ کہنا چاہوں گا کہ ——— کوئی مسلمان بھی قادیانیوں کا بحیثیتِ انسان مخالف نہیں نہ اُن کی عزت و آبرو کا دشمن ہے۔ البتہ اُن کی مضرت سے بچنا اپنا قدرتی حق خیال کرتا ہے۔ اگر جمہور مسلمانوں کے اس حق کا احترام کرتے ہوئے قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دے دیا جائے تو یہ ایک ایسا عمل ہوگا جو کئی ایک مفاسد کی روک تھام کرے گا۔ قادیانیوں کو حضرتِ علامہؒ کے اُٹھائے ہوئے اِس مطالبہ پر غور کرنا چاہیئے یہ اُن کے فائدے کی بات ہے۔ اور پھر جب اُن کے پیغمبر اور اُس کے جانشینوں کے نزدیک بھی وہ جمہور مسلمانوں سے ایک الگ اُمت ہی ہیں[1] تو پھر آئینی طور پر اس علیحدگی میں اُنہیں کیا قباحت نظر آتی ہے؟ مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہر لحاظ سے نہایت معقول ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی طور پر مسلمانوں سے الگ ہیں تو پھر سیاسی حیثیت میں بھی اُنہیں مسلمانوں سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ اور اگر وُہ خود ایسا نہیں چاہتے تو پھر حکومت کو اپنی ذمہ داری اور معاملے کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیئے۔

اب میں حضرتِ علامہؒ کے اُٹھائے ہوئے بعض نہایت اہم نکات کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ اس ضمن میں بعض انتہائی تلخ حقائق اور کچھ افسوسناک واقعات کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اگرچہ مجھے پتہ ہے کہ اس سے بعض جبینیں شکن آلود اور کچھ چہرے غضبناک ہوں گے مگر کیا کروں ان حقائق کو نظر انداز کرنا میرے بس میں نہیں۔ یہ قوم کی امانت تھی جو مجھے ودیعت ہوئی اور جو میں قوم کو لوٹا رہا ہوں ——— چل میرے خامے بسم اللہ!

۱۔ قادیانیت، یہودیت کی طرف رجوع ہے؟

حضرتِ علامہؒ نے آج سے اڑتیس برس پیشتر قادیانی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے سب سے

---

[1] حتیٰ کہ ۱۹۰۰ء میں بانیٔ قادیانیت نے حکومت سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ مردم شماری کے وقت اُن کی جماعت اور اُن کے پیروؤں کا نام عام مسلمانوں سے الگ رجسٹر کیا جائے۔ ملاحظہ ہو اشتہار واجب الاظہار منجانب مرزا غلام احمد قادیانی مطبوعہ ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء

پہلے اس بات کی نشان دہی کی تھی کہ:

"اس کا حاسد خدا کا تصوّر کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیئے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں، اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیّل اور اس کا روحِ مسیحؑ کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیّت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک ہی یہودیّت کی طرف رجوع ہے[1]"

مگر تب (۱۹۳۶ء میں) یہ محض ایک نظری بحث تھی، جس پر مزید رائے زنی اب بھی ممکن ہے مگر یہاں ایک بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اور وہ ہے فکر و خیال کے دائرے سے حرکت و عمل کے میدان تک قادیانیت کا یہودیّت کے مماثل اور پھر ان دونوں کے مابین ایک خاص قسم کے روابط و تعلقات کا موجود ہونا۔

برطانوی وزیرِ خارجہ مسٹر بالفور کے ۱۹۱۷ء کے اعلان کے مطابق جب ۱۹۴۸ء میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ فلسطین کی سرزمین پر قابلِ نفرین اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا تو جن عربوں کی یہ سرزمین تھی وہ سب چُن چُن کر باہر نکال دیئے گئے یہ شرف صرف قادیانیوں ہی کو عطا ہوا کہ وہ بلا خوف و خطر اور بصد تسلی و اطمینان وہاں رہیں اُن سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا چنانچہ خود میرزا بشیر الدین محمود (جنہیں قادیانی اپنے عقیدے کے مطابق "مصلح موعود" کا خطاب دیتے ہیں) نہایت فخریہ انداز میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عربی ممالک میں بے شک ہمیں اس قسم کی اہمیت حاصل نہیں جیسی اِن (یورپی اور افریقی) ممالک میں ہے پھر بھی ایک طرح کی اہمیت ہمیں حاصل ہوگئی ہے۔ اور وہ یہ کہ فلسطین کے عین مرکز میں اگر مسلمان رہے ہیں تو وہ صرف احمدی ہیں[2]"

اور تب سے اب تک قادیانیوں کے اسرائیلی یہودیوں کے ساتھ، جو بین الاقوامی صیہونیت کے علمبردار ہیں، نہایت گہرے دوستانہ تعلقات چلے آتے ہیں۔ اور اس میں سب سے زیادہ حیرت

---

[1] حرفِ اقبال، ص۱۱۵ لطیف احمد شروانی، ایم اے

[2] روزنامہ "الفضل" لاہور ص۳ ۳۰ / اگست ۱۹۵۰ء

تفصیل آمد خرچ مشنہائے بیرون

حیفا

(۱۲)

(اسرائیلی پونڈ
= ۲٫۶۷ روپے

آمد

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۴-۶۵	بجٹ ۶۵-۶۶	بجٹ ۶۶-۶۷
۱	چندہ تحریک جدید	۳،۴۰۰ (۱ تا ۶)	۱،۴۵۰	۱،۴۵۰
۲	۔ عام وحصہ آمد		۱،۶۰۰	۱،۶۰۰
۳	زکوٰۃ		۱۰۰	۱۰۰
۴	عید فنڈ			
۵	فطرانہ		۱۲۵	۱۲۵
۶	متفرق		۱۲۵	۱۲۵
	میزان آمد	۳۴۰۰	۳۴۰۰	۳،۴۰۰

خرچ

عملہ

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۴-۶۵	بجٹ ۶۵-۶۶	بجٹ ۶۶-۶۷
۱	مرکزی مبلغین ۱	۹۷۲	۹۷۲	۹۷۲
۲				
	میزان عملہ	۹۷۲	۹۷۲	۹۷۲

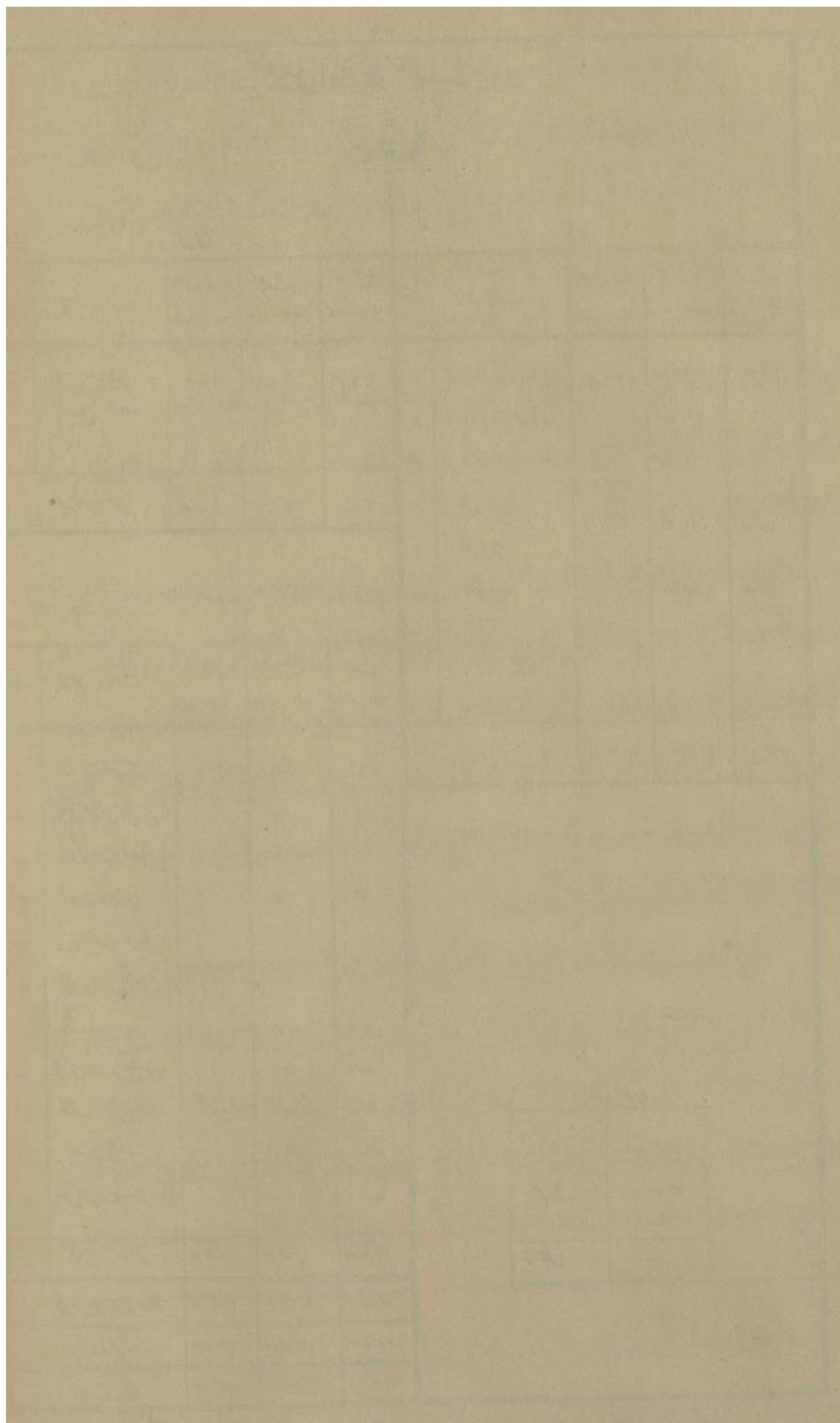
سائر

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۴-۶۵	بجٹ ۶۵-۶۶	بجٹ ۶۶-۶۷
۱	اشاعت لٹریچر	۱،۰۵۵ (۱ تا ۱۱)	۴۰	۴۰
۲	تبلیغی مجالس وعیدین		۶۰	۶۰
۳	۔ دورے وسفر خرچ		۴۰	۴۰
۴	مہمان نوازی		۵۰	۵۰
۵	کرایہ مکان فرنیچر			
۶	بجلی۔پانی۔گیس وغیرہ		-	-
۷	سٹیشنری		۱۵	۱۵
۸	ڈاک تار وٹیلیفون		۵۰	۵۰
۹	کتب اخبارات		۵۰	۵۰
۱۰	متفرق		۵۰	۵۰
۱۱	اخراجات رسالہ البشریٰ		۷۰۰	۷۰۰
	میزان سائر	۱،۰۵۵	۱،۰۵۵	۱،۰۵۵
	کل خرچ عملہ وسائر	۲،۰۲۷	۲،۰۲۷	۲،۰۲۷
	ریزرو مرکزی	۱،۳۷۳	۱،۳۷۳	۱،۳۷۳
	کل میزان	۳۴۰۰	۳۴۰۰	۳،۴۰۰

خلاصہ

آمد	۳،۴۰۰
خرچ	۳،۴۰۰
خالص	-

احمدیہ تحریک جدید کے سالانہ بجٹ ۱۹۶۶-۶۷ء کے صفحہ ۲۵ کا عکس۔



کی بات یہ ہے کہ پاکستان اور پاکستانی عوام کے نزدیک اسرائیل کا وجود ہی غلط ہے۔ وُہ اسے سازش اور جارحیت کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ پاکستان، اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کا سب سے بڑا حمایتی ہے اور اس نے اس عرب دوستی کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کا سب سے بڑا دشمن اسرائیل ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ اسرائیل کے بانی ڈیوڈ بن گوریان کی وُہ تقریر جو اُس نے اگست ۱۹۶۷ء میں ساربون یونیورسٹی پیرس میں کی وُہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ بن گوریان نے کہا:

"پاکستان دراصل ہمارا آئیڈیالوجیکل چیلنج ہے ——— بین الاقوامی صہیونی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیئے اور نہ ہی پاکستان کے خطرے سے غفلت کرنی چاہیئے۔ پاکستانی عوام عربوں سے محبت کرتے ہیں اور یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے یہ محبت خود عربوں سے زیادہ خطرناک ہے لہٰذا ہمیں پاکستان کے خلاف جلد سے جلد قدم اُٹھانا چاہیئے۔ پاکستان میں فکری سرمایہ اور جنگی قوت ہمارے لیئے آگے چل کر سخت مصیبت کا باعث بن سکتا ہے لہٰذا ہندوستان سے گہری دوستی ضروری ہے بلکہ ہمیں اُس تاریخی عناد و نفرت سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے جو ہندوستان، پاکستان کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی عناد و نفرت ہمارا سرمایہ ہے۔ ہمیں پوری قوّت سے بین الاقوامی دائروں کے ذریعے سے اور بڑی طاقتوں میں اپنے نفوذ و اثر سے کام لے کر ہندوستان کی مدد کرنی چاہیئے اور پاکستان پر بھرپور ضرب لگانے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ یہ کام نہایت رازداری کے ساتھ اور خفیہ منصوبوں کے تحت انجام دینا چاہیئے۔"[1]

اس پس منظر میں یہ بات اور زیادہ اہم اور تعجب خیز ہو جاتی ہے کہ اسی اسرائیل نے ایک ایسی جماعت کو آخر کیوں اپنے سینے سے لگا رکھا ہے جس کا ہیڈ کوارٹر ہی اُس کے آئیڈیالوجیکل چیلنج ———

---

[1] یروشلم پوسٹ، ۹ اگست ۱۹۶۷ء بحوالہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور صا مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء و ۲ ستمبر ۱۹۷۲ء

پاکستان ــــــ میں واقع ہے اور جس کا سربراہ اور دیگر منصبدار سب پاکستانی ہیں۔ آخر قادیانی وہاں کیا کرتے ہیں؟ قادیانیوں کا مفروضہ یہ ہے کہ وُہ "تبلیغِ اسلام" کے لیئے وہاں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وُہ کس کو تبلیغ کرتے ہیں؟ کیا اُن یہودیوں کو جو اپنی تمام عصبیتوں کے تحت وہاں اکٹھے ہیں اور اپنی مملکت کا استحکام اور اس کی توسیع چاہتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں، تو پھر کیا اُن عربوں کو مسلمان بنانے کے لیئے یہ مشن قائم ہے جو پہلے ہی رسولِ عربیؐ کے حلقہ بگوش ہیں۔ عرب احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو چھوڑ کر غلام احمد کے متبع بن جائیں گے؟ ناممکن۔ تو پھر معاملہ کیا ہے؟

ایک مشہور یہودی فوجی ماہر پروفیسر ہرٹز کا کہنا ہے:

"پاکستانی فوج اپنے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غیر معولی عشق رکھتی ہے۔ اور یہی وُہ بنیاد ہے جس نے پاکستان اور عربوں کے باہمی رشتے مستحکم کر رکھے ہیں۔ یہ صورتِ حال عالمی یہودیت کے لیئے شدید خطرہ رکھتی ہے اور اسرائیل کی توسیع میں حائل ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہودیوں کو چاہیئے کہ وُہ ہر ممکن طریقے سے پاکستانیوں کے اندر سے حُبِ رسولؐ کا خاتمہ کریں[1]۔"

اگر پروفیسر ہرٹز کی مذکورہ رائے، ڈیوڈ بن گوریان کی تقریر، International Zionism کے طرزِ عمل اور قادیانیت کے مخصوص تاریخی و سیاسی پس منظر، جس کی ایک گُونہ تشریح پیچھے ہو چکی ہے، کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قادیانی جماعت بین الاقوامی صہیونیوں کے ہاتھ میں کٹ پُتلی ہے اور وُہ اس سے اپنے حسبِ منشا کام لیتے ہیں۔ بالخصوص دُنیائے اسلام کے قلعہ ــــ پاکستان ــــ کے خلاف اس کا کردار بڑا گھناؤنا دکھائی دیتا ہے اور اس تاثر کو مُوجودہ وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اُس بیان سے اور زیادہ تقویت ملتی ہے جس میں انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ پاکستان کے عام انتخابات (۱۹۷۰ء) میں اسرائیلی روپیہ پاکستان آیا اور انتخابی مُہم میں اس کا استعمال ہوا تھا۔ آخر وُہ روپیہ کس کے توسط سے پاکستان آیا؟ پاکستان کے وجود کے خلاف تل ابیب میں تیار کی گئی سازش (جس کا انکشاف خود وزیرِ اعظم بھٹو نے "الاہرام"

---

[1] روزنامہ نوائے وقت، ص ۶، ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء

کے ایڈیٹر مسٹر حسنین ہیکل کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کیا)[1] کیسے پروان چڑھی! پاکستان میں بین الاقوامی صہیونیوں کی آلۂ کاری کس نے کی! ان سب سوالات کا تمام تر جزئیات سمیت جواب تو جناب وزیراعظم بھٹو ہی دے سکتے ہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ قادیانی جماعت کے ایک مشہور چہرے اور پاکستان کی بیوروکریسی کے ایک رُکن رکین پر یہ الزام تو کئی ایک ذمہ دار حلقوں نے بارہا عائد کیا کہ اُس نے ایوب خان کی گول میز کانفرنس کو ناکام بنانے اور مارشل لا کا راستہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے پس پردہ یہودی اثرات کارفرما تھے۔ پاکستان کے ایک مشہور اور قابلِ احترام سیاستدان مولوی فرید احمد نے اپنی کتاب The sun behind the clouds میں اس شخص کا نام لے کر لکھا ہے کہ ایوب خان کی 'گول میز کانفرنس' کے دوران یہودیوں نے اُسے استعمال کیا[2] حیرت ہے کہ آج تک پاکستان کی کسی حکومت نے بھی ان 'تعلقات' کا نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ ستم تو یہ ہے کہ پاکستان کا لاکھوں روپے کا زرِمبادلہ بیرونی ملکوں میں 'تبلیغ اسلام' کے نام پر قادیانیوں کے سپرد کر دیا جاتا رہا۔ کیا تصورِ پاکستان کے خالق کی رُوح اس پر ماتم نہ کرتی ہوگی، جنہوں نے فرمایا تھا کہ:

'ہمیں دُنیائے اسلام سے متعلق قادیانیوں کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے'[3]

بہرحال میرا مقصد حضرتِ علامہؒ کے ایک اہم نکتے اور اس کی تشریح میں بعض ناقابلِ تردید حقائق کا بیان تھا جو میں نے کر دیا۔ اس سے آگے ذمہ داری میری نہیں کسی اور کی ہے۔

۲۔ قادیانی اور کمیونسٹ

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کمیونسٹ تحریک سے ہمدردی

○ یہ صاحب آج کل 'ورلڈ بینک' کے ایک اونچے عہدہ پر فائز ہیں۔ یہ بینک اقوامِ متحدہ کی ایک ذیلی شاخ کی حیثیت رکھتا اور اس پر بین الاقوامی صہیونیوں کا اثر غالب ہے۔

[1] 'نوائے وقت' لاہور ص۱ ۷ اپریل ۱۹۷۳ء

[2] 'ابر آلود سورج' از مولوی فرید احمد

[3] 'حرفِ اقبال' ص۱۲۳ لطیف احمد شروانی

رکھنے اور مذہب کو افیون قرار دینے والے عناصر قادیانی تحریک کے بارے میں زبان نہیں کھولتے۔ بلکہ اُن کی اکثر کوشش یہی ہوتی ہے کہ قادیانیوں کے خلاف کوئی آواز نہ اُٹھے۔ وُہ ہر مقام پر قادیانیوں کی مخالفت سے گریز کرتے اور اس "ایماندارانہ مسئلہ" کو فرقہ دارانہ جھگڑا کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے اور مذہباً دہریہ تھے۔ علامہ اقبالؒ نے قادیانیت کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اس کے خلاف اپنے بیانات چھپوائے تو پنڈت جواہر لال اپنی تمام تر "دہریت مآبی" کے باوجود قادیانیت کی حمایت پر اُتر آئے اور "ماڈرن ریویو" کلکتہ میں "مسلمان اور احمدزم" کے عنوان سے یکے بعد دیگرے تین مضمون لکھ مارے۔ ایسا کیوں ہے ؟ یا ایسا کیوں ہوا؟ میرے خیال میں حضرت علامہؒ نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا وہی قادیانیوں اور کمیونسٹوں کے درمیان نقطۂ اتصال ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"------ (ہندوستان میں) مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے اور بالآخر مذہب کے اہم عُنصر کو اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیتے ہیں[1]۔"

ظاہر ہے اس طرح ایک طرف مذہب پر زد پڑتی اور دوسری طرف کمیونزم کے فلسفہ کے لیئے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ اور یہی "مقصود" ہے جس کے حصول کی خاطر ایک کمیونسٹ، ایک نام نہاد نبی کی نبوت کو گوارا کرتا یا اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اور ویسے بھی ایک فلسفہ ربِّ محمدؐ کا باغی، دوسرا خود محمدؐ کا باغی بھلا یہ دونوں ایک دوسرے کے لیئے اپنے دل میں "نرم گوشہ" کیوں نہ رکھیں؟

حضرتِ علامہؒ نے اس حقیقت کی نشاندہی آج سے اڑتیس برس پیشتر کی۔ تب سے اب تک بالخصوص تقسیم کے بعد، برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں پر جو بیتی اُسے "قادیانی کمیونسٹ ارتباط" کے پسِ منظر میں دیکھا جائے تو یہ اڑتیس برس اُس کی تفسیر نظر آئیں گے۔ اے کاش! ہمارے دانشور اور ہمارے "فرمانروا" اس پر غور کریں۔

---

[1] "حرفِ اقبالؒ"، ص۱۱۱ لطیف احمد شروانی، ایم اے

۳۔ قادیانی مسلمان کہلانے پر اِصرار کیوں کرتے ہیں؟

حضرتِ علامہؒ نے اس بات پر بھی بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی ہے کہ قادیانی مسلمانوں کا جُزو بنے رہنے پر اِصرار کیوں کرتے ہیں؟ اُن کے خیال میں ایسا صرف اس لیے ہے:

'۔۔۔۔ کہ اُن کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ اُنہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں'[1]

اُن کے خیال میں اور اس خیال کی صداقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے:

'قادیانی حکومت سے کبھی علیٰحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے'[2]

اور اس کی وجہ وہی 'سیاسی فوائد' ہیں جن کی طرف میں نے ابھی حضرتِ علامہؒ کے حوالے سے اشارہ کیا اور میرے خیال میں حضرتِ علامہؒ کی یہ عبارت اُن 'سیاسی فوائد' کی بڑی اچھی تشریح کرتی ہے، جس میں وُہ کہتے ہیں:

'اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیٰحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں پھر وُہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو ۵۶۰۰۰ (چھپن ہزار) ہے اُنہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لیے انہیں سیاسی اقلّیت کی حیثیت بھی نہیں مِل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جُداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ وُہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں اُن کی نمائندگی نہیں ہو سکتی'[3]

---

[1] 'حرفِ اقبال'، صفحہ ۱۲۸ لطیف احمد شروانی

[2] 'حرفِ اقبال'، صفحہ ۱۲۹ لطیف احمد شروانی

[3] 'حرفِ اقبال'، صفحہ ۱۲۸ لطیف احمد شروانی

مخلوط طریقِ انتخاب کے باوجود آج بھی پوزیشن قریب قریب وہی ہے جو آج سے اڑتیس برس پیشتر تھی۔ اگر قادیانیوں کو غیر مُسلم اقلیت قرار دے دیا جائے تو ایک طرف اُن کی وُہ تمام کلیدی ملازمتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں جن کے سہارے قادیانیّت کے بھیانک سائے تیزی کے ساتھ ارضِ پاک پر پھیل رہے ہیں، دوسری طرف اسمبلیوں میں اُنہیں بمشکل ایک آدھ نشست ملتی ہے۔ جبکہ مسلمانوں میں شمولیت کا ڈھونگ رچا کر پنجاب اسمبلی سے سینیٹ تک وُہ کئی نشستوں پر قبضہ جما چکے اور پاکستان کی سیاست میں ایک اہم عُنصُر کی حیثیت سے بڑے مخصوص اور غیر محسوس انداز میں اپنا نقش جما رہے ہیں۔ اور یقیناً یہی وُہ سیاسی اَغراض ہیں جن کی خاطر قادیانی نت نئی تاویلیں گھڑتے اور مسلمانوں کا جُزو بنے رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ میرزا ناصر احمد خلیفۂ ثالث، نے صدر اور وزیرِ اعظم کے حلف ناموں میں عقیدۂ ختمِ نبوّت کا اِقرار ضروری قرار دیئے جانے پر یونہی تو یہ بیان نہیں دیا تھا کہ:

"میں نے اس حلفنامہ کے الفاظ پر بڑا غور کیا ہے اور میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک احمدی کے راستہ میں اس حلف کے اُٹھانے میں کوئی روک نہیں ہے۔"[1]

ظاہر ہے حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مان کر بھی قادیانیوں کے نزدیک حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اتّباع میں نبوّت کا سلسلہ جاری رہ سکتا، میرزا غلام احمد کی نبوت ظل و بروز کا جامہ اوڑھ کر برقرار رہتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہوسِ اقتدار کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو کر قادیانی معتقدات کے مطابق ربوہ دنیوی لحاظ سے بھی ایک اہم مقام بن جاتا ہے[2] پھر بھلا یہ حلفنامہ ایک قادیانی کی راہ میں روک کیسے ہو؟ سچ فرمایا آپ نے میرزا صاحب سچ فرمایا۔

---

[1] "آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ" مصنّفہ مرزا ناصر احمد "خلیفہ ثالث"، شائع کردہ نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیفِ صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ۔

[2] قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ "آسمانی نوشتوں میں لکھا ہے اور وُہ پورا ہو کر رہے گا کہ یہ مقام (ربوہ) دُنیوی لحاظ سے بھی ایک اہم مقام بن جاوے گا" اس عبارت کا ایک ایک لفظ "الفضل" نامی قادیانی روزنامے سے منقول ہے۔ ملاحظہ ہو اشاعت بابت ۷، فروری ۱۹۵۱ء تب یہ اخبار لاہور سے شائع ہوتا تھا۔

۴۔ مذہب میں 'عدم مداخلت' کی پالیسی اور ہم!

حضرت علامہؒ کے نزدیک 'ہندوستان میں انگریزوں کی یہ پالیسی کہ وُہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہ کریں گے، ہندوستان میں بسنے والے تمام مذاہب کے لیے ضرر رساں تھی۔ کیونکہ اُن سب کی بقا، اُن کے اندرونی استحکام کے ساتھ وابستہ تھی اور اگر اندرونی استحکام کو ٹھیس لگتی اور حکومت 'مذہبی معاملات میں عدم مداخلت' کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اُس کے تحفظ کی خاطر کوئی قدم نہیں اُٹھاتی تو ظاہر ہے اُس جماعت کی سالمیت کو ضرور ضرر پہنچے گا چنانچہ وُہ اس امر پہ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'اس پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بد قسمتی سے بہت بُرا اثر ڈالا ہے' جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلم جماعت کا استحکام اس سے کہیں کم ہے جتنا حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت تھا[1]۔ ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کرسکتا ہے۔ اور یہ برل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلادے° اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں'[2]

آج بھی اگر کسی ملک کی حکومت اس نام نہاد 'عدم مداخلت' کی پالیسی پر کاربند رہتی ہے تو ظاہر ہے اُس کا یہ عمل اُس ملک میں بسنے والے مذاہب کے لیے مہلک ہی ثابت ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریز اگر اس پالیسی کو اختیار نہ کرتے تو کون سی پالیسی اختیار کرتے؛ ظاہر ہے اگر وُہ اس کے برعکس مداخلت کی پالیسی اپناتے تو خود اُن کے اقتدار کو دھچکا لگتا۔ لہٰذا انہوں نے

° جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروؤں نے کیا۔

[1] رومن کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ وُہ مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار ہے۔

[2] 'حرفِ اقبالؒ'۔ صہ ۱۱۶ لطیف احمد شروانی

وُہ پالیسی اپنائی جس سے اِس ملک میں بسنے والے مذاہب و اقوام کی وحدت پر زد پڑتی مگر اُس کا اقتدار استحکام پکڑتا تھا۔ اور یہ بھی اُس نے اُس حد تک ہی اپنائی جس حد تک کہ اُس کو فائدہ پہنچا سکتی تھی

دراصل انگریز کی پالیسیاں کوئی سے اخلاقی سانچوں میں ڈھلی ہوئی نہ ہوتی تھیں، وُہ تو اس کے مفاد کے تابع تھیں گویا ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے اور۔ اسی مذہب میں مداخلت نہ کرنے کا نعرہ لگانے والے انگریز نے جب دیکھا کہ ہندوستان کی مختلف قومیں آپس میں ایکا کر کے اُس کے اقتدار کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہیں تو اُس نے مذہب میں مداخلت کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور یہ حقیقت تو اَم نشرح ہے کہ سکھ ۱۹۱۹ء تک ہندوؤں ہی کا ایک حصّہ شمار ہوتے تھے، لاہور ہائی کورٹ نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ سکھ، ہندو ہیں، سکھوں کی طرف سے علیحدگی کا کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا گیا تھا مگر انگریز نے اپنی مشہورِ زمانہ 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کے ماتحت ۱۹۱۹ء میں سکھوں کو ہندوؤں سے جُدا گانہ جماعت قرار دے دیا[1] یہ دوسری بات کہ اُس نے یہی فیصلہ 'مُسلم قادیانی نزاع' میں نہ کیا، اور یہ بھی Divide and Rule کے عین مطابق تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے پاکستان میں کون سی پالیسی اختیار کی جانی چاہیئے؟ ہمارے ہاں یُوں تو مذہبی معاملات میں اکثر ٹانگ اڑائی جاتی ہے مگر جب بعض اندرونی و بیرونی اسلام دُشمن تحریکوں کے انسداد یا اُن کی مخصوص حرکات پر گرفت کی باری آتی ہے تو ہمارے مُسلمان حکمران عجیبُ شانِ بے نیازی، کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بلکہ ۱۹۵۳ء میں تو ایسا بھی ہوا کہ حُبِ رسولؐ کے جذبہ سے سرشار اور ناموسِ مصطفیٰؐ کا تحفظ چاہنے والے بے گناہ مسلمانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ حالانکہ ایک مسلمان حکومت ہر لحاظ سے اس امر کی پابند ہے کہ وُہ مسلمانوں کی ملی وحدت کا تحفظ کرے اور ظاہر ہے اس کے لیئے 'سترِ وحدت، کی حفاظت شرطِ اوّلین ہے کہ

ع حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازو

---

[1] حرفِ اقبالؒ صہ ۱۲۹ لطیف احمد شروانی

اور میرے نزدیک تو معاملہ اب صرف جداگانہ اقلیت یا ملّی وحدت کے تحفظ ہی کا نہیں رہا بلکہ اپنے مخصوص احوال و ظروف کے ماتحت جن کی کسی قدر تشریح پیچھے ہو چکی ہے، خود ہمارے ملک کی بقا و سلامتی سے جا کر مل گیا ہے ——— گویا عقیدۂ ختمِ نبوّت کا آئینی تحفظ اب صرف سترِ وحدتِ ملت، ہی کا تحفظ نہیں بلکہ 'وحدتِ ارضِ پاک' کی بقا و سلامتی کا راز بھی یہی ہے!

۵۔ ختمِ نبوّت اور 'رَوادار مسلمان'

بعض سمجھ دار لوگ جان بوجھ کر یہ ناسمجھی کی بات کرتے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کی وحدت کا تحفظ چاہنا یا قادیانیوں کے احتساب کا مطالبہ کرنا 'فرقہ دارانہ منافرت' پھیلانا ہے اور کہ مسلمانوں کو 'فرقہ پرست' نہیں ہونا چاہیئے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ ایک سچا مسلمان کبھی فرقہ پرست نہیں ہوتا، وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوا ہر وقت اُس کے پیشِ نظر رہتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک 'ایماندارانہ مسلک' خواہ مخواہ 'فرقہ دارانہ' قرار دے دیا جائے۔ شاید یہ لوگ اپنے آپ کو 'روادار' ثابت کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر حقیقت یہی ہے تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وُہ رواداری کا حقیقی مفہوم بالکل نہیں سمجھتے۔ اُن کے لیے حضرتِ علامہؒ کی یہ عبارت سُرمۂ بصیرت کی حیثیت رکھتی ہے:

> 'اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وُہ لفظ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رواداری کی روح ذہنِ انسانی کے مختلف نقاطِ نظر سے پیدا ہوتی ہے گبن کہتا ہے کہ 'ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں، ایک رواداری مؤرخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں، ایک رواداری مدبّر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں، ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے کیونکہ وُہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے، ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلّت کو جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص پر کی

جاتی ہے برداشت کر لیتا ہے' یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قسم کی رواداری
اخلاقی قدر سے مُعرّا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس سے اُس شخص کے رُوحانی
افلاس کا اظہار ہوتا ہے جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ حقیقی رواداری
عقلی اور رُوحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی
ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت
کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے ایک
سچا مُسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے[1]۔

حضرتِ علامہؒ کو اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ 'قادیانی فتنہ' کو سمجھنے کی تعلیمیافتہ مسلمانوں نے کوئی کوشش نہیں کی بقول اُن کے مغربیت کی ہوا نے ان لوگوں کو حفظِ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے[2] اس کے مضرات کو اگر کسی نے سمجھا یا اس کے خلاف سرگرمی دکھائی تو بقول حضرت علامہؒ وُہ عام مسلمانوں کا طبقہ تھا، جسے تعلیم یافتہ مُسلمان 'مُلّا زدہ' کا خطاب دیتا ہے[3]۔ ——— اور اگر آج پڑھا لکھا طبقہ اس نبیٔ اُمّت، اور اس کے مفاسد کو کچھ کچھ سمجھ رہا ہے تو یہ برس ہا برس کی جِدّوجُہد اور بہت سے تلخ تجربات و مشاہدات کا ثمر ہے ——— مگر اس کا کیا کیا جائے کہ یہ طبقہ عالمی استعمار کے اس مُہرے کے خلاف زبان کھولنے سے اب بھی ہچکچاتا اور مُنہ موڑتا ہے۔

بہرحال اگر ہمارے تعلیم یافتہ طبقے یا نام نہاد روادار مسلمان نے اپنا یہ طرزِ عمل تبدیل نہ کیا تو وقت اُنہیں خود ایسا کرنے پر مجبور کر دے گا۔

---

[1] حرفِ اقبالؒ، صفحہ ۱۴۳،۱۴۲، لطیف احمد شروانی، ایم اے

[2] حرفِ اقبالؒ صفحہ ۱۱۶ لطیف احمد شروانی ایم اے

چند شبہات اور اُن کا اِزالہ

قادیانی مُیٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھُو، کے مصداق سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر اکثر دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ علامہ اقبال تو قادیانی تحریک کو ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کا نمونہ سمجھتے تھے دیکھو اُن کا خطبۂ علیگڑھ ۱۹۱۰ء فلاں صفحہ، فلاں سطر۔ اور ۲۹ ستمبر ۱۹۰۰ء کی فُلاں تحریر میں انہوں نے مرزا غلام احمد کو جدید ہندی مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی مفکر قرار دیا۔ قادیانیوں کے پاس لے دے کر یہی دو حوالے ہیں جن کی مدد سے وُہ حضرتِ علامہؒ کو قادیانی تحریک کا ہمنوا ثابت کرتے ہیں۔

اب سُنیئے اس کی حقیقت کیا ہے؟ پہلی عبارت تو واقعۃً حضرتِ علامہؒ کی ایک ترجمہ شُدہ کتاب ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، میں موجود ہے۔ دوسری جو رسالہ انڈین اینٹی کویری کے حوالہ سے پیش کی جاتی ہے ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزری اور قادیانیوں پر اس بارے میں زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا بہرحال عبارت پہلی ہو یا دوسری (قطع نظر اس بات کے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں) اول تو اِن میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوّت کا اثبات نہیں دوسرا جب وُہ خود ان کی نفی کر چکے ہیں تو پھر ان سے دلیل پکڑنا یا انہیں حجت ٹھہرانا کیسا؟ مثلاً وُہ اپنی ۱۹۱۰ء کی عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرتے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی اُمید تھی۔ اس تقریر سے بہُت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہُت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے بانیٔ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسُومہ براہینِ احمدیہ، میں انہوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی

لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل رُوح ایک دن میں نُمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں[1] کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیٔ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی؟ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت ——— بانیٔ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت ——— کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے آں حضرتؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سُنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویّہ میں کوئی تناقُض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وُہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتّھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔[2]

دراصل حضرتِ علامہؒ کی پہلی رائے قادیانیت کے ظاہری خَول اور اس کے پروپیگنڈے پر مبنی تھی۔ اور اگر اُس دَور کے پسِ منظر میں دیکھا جائے تو یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں۔ یہ تو ایک عُمومی تاثر تھا۔ جو آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مرزا غلام احمد کے اس وقت کے نام نہاد[3] مناظروں اور

---

[1] قادیانی اور لاہوری۔ اوّل الذکر مرزا غلام احمد کو 'نبی' مانتا اور اس کے منکرین کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتا ہے۔ ثانی الذکر مرزا غلام احمد کو 'مجدد' تسلیم کرتا ہے۔

[2] 'حرفِ اقبالؒ' صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳ لطیف احمد شروانی ایم اے

[3] 'نام نہاد مناظرے اور مباحثے' اس لیے کہ مرزا غلام احمد نے جو کچھ بھی لکھا یا کہا وُہ سب انگریزی اقتدار کے استحکام کی غرض سے تھا۔ چنانچہ وُہ خود لکھتے ہیں: "ہاں میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نیک نیتی سے دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مباحثات بھی کیا کرتا ہوں اور ایسا ہی پادریوں کے مقابل پر بھی مباحثات کی کتابیں شائع کرتا رہا ہوں اور میں اس بات کا بھی اقراری ہوں کہ جبکہ بعض پادریوں اور عیسائی مشنریوں کی تحریر نہایت سخت ہو گئی ——— تو یہ اندیشہ (میرے) دل میں پیدا ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی

مباحثوں سے پیدا ہوگیا اور ایک حضرتِ علامہؒ ہی پر کیا موقوف تب پنجاب کے اکثر مسلمان اِسی غلط فہمی کا شکار تھے۔ وُہ ایک پُرجوش مبلغ و مُناظر کی حیثیت سے مرزا غلام احمد کو اسلام کا مخلص اور مسلمانوں کا بہی خواہ خیال کرتے۔ خود حضرتِ علامہؒ کے گرد و پیش حتیٰ کہ ان کے والد (شیخ نُور محمد) اور بڑے بھائی (شیخ عطا محمد) تک مرزا غلام احمد سے متاثر تھے۔ بلکہ شیخ نور محمد صاحب نے تو مرزا صاحب کی بیعت بھی کی ہوئی تھی۔ مگر جب مرزا غلام احمد کے مخفی عزائم و دعادی بے نقاب ہوئے تو مسلمانوں کا سوادِ اعظم اُن سے الگ ہوگیا۔ نہ صرف الگ ہوگیا بلکہ قادیانی تحریک کو اپنی وحدتِ ملی کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہوئے اس کی زبردست مزاحمت بھی کرنے لگا۔ ان حالات کا حضرتِ علامہؒ اور ان کے گرد و پیش پر اثرانداز ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ حضرتِ علامہؒ نے اپنی اُس رائے سے جو محض قادیانی تحریک کے ظاہر سے متاثر ہو کر قائم کی گئی تھی رجوع کر لیا۔ اُن کے والد شیخ نُور محمد صاحب نے بھی قادیانی تحریک سے اپنی وابستگی ختم کر دی، بڑے بھائی بھی بیزار ہو گئے۔ اور پھر وُہ وقت بھی آیا جب حضرتِ علامہؒ نے قادیانیت کو "برگِ حشیش"، "غارت گرِ اقوام"، "فتنۂ ملّتِ بیضا"، "قوّتِ فرعون کی در پردہ مُرید"، "یہودیت کا مثنیٰ"، "اِنتشار کا منبع"،

توم ہے اِن کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا ہو تب میں نے اُن جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کے دبانے کے لیے حکمتِ عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تا سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بے امنی پیدا نہ ہو تب میں نے بمقابل ایسی کتابوں کے جن میں کمال سختی سے بدزبانی کی گئی تھی چند ایسی کتابیں لکھیں جن میں کسی قدر بالمقابل سختی تھی کیونکہ میرے کانشنس نے قطعی طور پر مجھے فتویٰ دیا کہ اسلام میں جو بہت سے وحشیانہ جوش والے آدمی موجود ہیں ان کے غیظ و غضب کی آگ بُجھانے کے لیے یہ طریق کافی ہوگا کیونکہ عوض معاوضہ کے بعد کوئی گلہ باقی نہیں رہتا۔" (تریاق القلوب، ضمیمہ نمبر ۳ ص ب مؤلفہ مرزا غلام احمد قادیانی۔ مطبوعہ ۱۹۰۲ء)

[1] حضرتِ علامہؒ کے بڑے بھائی کا بیٹا (شیخ اعجاز احمد) آج بھی مرزائی ہے اور بڑا غالی و کٹر قسم کا مرزائی۔ اور اُن کے اہلِ خاندان اس کے جو وجوہ بیان کرتے ، وُہ ناگفتنی ہیں۔

فرنگی استداب کے حق میں الہامی سند مرزا غلام احمد کو چنگیز، اور قادیانیوں کو اسلام اور ملک کا غدار قرار دے کر مسلمانوں سے الگ کر دینے کا پُرزور مطالبہ کیا۔ اور یورپ تک اس فتنے کا تعاقب کیا۔ یہاں میں قارئین کی توجہ مرزا غلام احمد کے فرزند اور قادیانی تحریک کے ایک اہم ستون مرزا البشیر احمد ایم اے کی اُس تحریر کی جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں جس میں وُہ کہتے ہیں:

"ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا ------ شیخ نور محمد صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی ان دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وُہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اس لیے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو اُن کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ ------ آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام گیا جس میں لکھا تھا کہ شیخ نُور محمد کو کہہ دیویں کہ وُہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں ------ ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نوتعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈا تھا"[1]

---

[1] سیرت المہدی، ج ۳، ص ۲۴۹ مرزا البشیر احمد ایم اے طبع اوّل، اپریل ۱۹۳۹ء

فرمایئے اس کے بعد ۱۹۰۰ء کی کسی عبارت یا خُطبۂ علیگڑھ کے سہارے قائم کیے گئے کسی استدلال میں کیا وزن رہ جاتا ہے؟ حیرت ہے کہ جس دَور کو حضرتِ علاّمہؒ اپنا دَورِ جاہلیت قرار دیتے رہے اُس کی ایک آدھ تحریر تو قادیانیوں کے لیے حجّت اور سند کا درجہ رکھتی ہے مگر جس عمر میں وُہ پُختہ ہو کر مسلمانوں کی محبوب فکری متاع بن چکے تھے اُس عمر کی متاعِ فکر سے گریز و فرار اختیار کیا جاتا یا صریحاً انکار کر دیا جاتا ہے۔ یا للعجب!

۲—

یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اگر حضرتِ علاّمہؒ قادیانیوں کو مسلمان نہ سمجھتے تھے تو پھر خالصتہً مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر اُٹھنے والی تحریک ـــــ تحریکِ کشمیر ۱۹۳۱ء کی صدارت انہوں نے حضرت امام جماعتِ احمدیہ خلیفۃُ المسیح الثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کو کیوں پیش کی؟ اور پھر اس جھوٹ پہ جھوٹ کھڑا کرتے ہوئے کہا جاتا ہے "یہ بات علاّمہ کے اُن گہرے روابط اور اُس موانست کو ظاہر کرتی ہے جو وُہ جماعتِ احمدیہ سے رکھتے تھے"

؎ اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!

حالانکہ نہ حضرتِ علاّمہؒ نے مرزا محمود کا نام تجویز کیا اور نہ ہی وُہ قادیانیوں سے کوئی ربط یا اُنس رکھتے تھے۔ قادیانی جو چاہیں کہیں، حضرت علاّمہؒ نے قادیانیت پر جو ضربِ کاری لگائی قادیانی آج تک اُسے نہیں بُھلا سکے ہیں۔ اور عبدالمجید سالک کو بھی اپنی تمام تر قادیاں نوازی کے باوجود یہ لکھنا پڑا ہے کہ ردِّ قادیانیت میں حضرتِ علاّمہؒ نے بعض ایسے نکات پیش کیے، جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرتِ علاّمہؒ نے کشمیر کمیٹی میں شمولیت اختیار کی تو اُن کے سامنے صرف اور صرف مظلومینِ کشمیر کا مسئلہ تھا، جو برسہا برس سے ڈوگرا حکمرانوں کے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کا شکار تھے۔ وُہ قادیانی نبوت یا خلافت پر مہرِ تصدیق ثبت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حضرتِ علاّمہؒ کو چونکہ خطۂ کشمیر سے قلبی لگاؤ تھا اور یہ ارضِ چنار اُن کے آباؤ اجداد کا وطن تھی۔ اس لیے کشمیر میں

---

[1] "ذکرِ اقبالؒ" صہ ۲۱۱ عبدالمجید سالک

کے ساتھ جذباتِ ہمدردی کی شدت میں وُہ مرزا بشیر الدین محمود کے سیاسی عزائم کو نہ بھانپ سکے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وُہ اور اُن کی طرح دیگر مسلمان عمائدین قادیانیوں کے انگریزوں کے ساتھ خصوصی تعلقات کے پیشِ نظر یہ اُمید بھی کرتے ہوں کہ قادیانی خلیفہ اپنے آقاؤں سے کشمیری مسلمانوں کو بعض حقوق دِلانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ مرزا محمود نے اپنے لامحدود اختیارات ——— 'لامحدود' اس لیے کہ جب کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کا قیام عارضی ہوگا سرے سے اُس کا کوئی دستور ہی نہ بنایا گیا اور بقول حضرتِ علّامہؒ 'صدر — (مرزا محمود) — کو آمرانہ اختیارات دے دیئے گئے'[2]۔ مرزا محمود نے ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں کی ذیلی شاخ بنا کر رکھ دیا اور عام مسلمانوں کے چندے سے قادیانی مبلغ سارے کشمیر میں پھیلا دیئے (چنانچہ یہ اُسی زمانے کی جدوجہد کا ثمر ہے کہ آج بھی کشمیر میں اس جماعت کے اچھے خاصے اثرات پائے جاتے ہیں) اور نہ صرف طول وعرضِ کشمیر بلکہ پوری دُنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ تمام اسلامی ہند نے اُسے اپنا لیڈر مان کر اُس کے باپ مرزا غلام احمد کی نبوّت کی تصدیق کر دی ہے اور اس کے ساتھ ہی جب یہ بات ان کے علم میں آئی کہ کشمیر کمیٹی کے صدر (مرزا محمود) اور سیکرٹری (عبدالرحیم) دونوں وائسرے اور دیگر اعلیٰ برطانوی حکّام کو خُفیہ اطلاعات بہم پہنچانے کا 'نیک کام' بھی کرتے ہیں[2] تو انہوں نے اس کا انتہائی سختی سے نوٹس لیا اور مرزا محمود کو کمیٹی کی صدارت چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ قادیانیوں کی منافقت کے ہاتھوں عاجز آ کر خود استعفا دے دیا، کمیٹی تک توڑ ڈالی۔ اس موقع پر حضرتِ علّامہؒ نے جو بیان جاری کیا اُس کا یہ حصّہ خاص طور پر بڑا دلچسپ اور اہم ہے:

'بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وُکلا میں سے ایک صاحب نے جو میرپور کے مقدّمات کی پیروی کر رہے تھے حال ہی میں

---

[1] 'حرفِ اقبالؒ' صفحہ ۲۰۲ لطیف احمد شروانی ایم اے

[2] 'پنجاب کی سیاسی تحریکیں' صفحہ ۲۱ عبداللہ ملک

اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے صاف طور پر کہا کہ وُہ کسی 'کشمیر کمیٹی' کو نہیں مانتے اور جو کچھ انہوں نے یا اُن کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وُہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اُن کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہو گا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔ میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وُہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اُسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی رُوحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مُرید بن جائے۔ .... ان حالات کے پیشِ نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔"[1]

قادیانیوں نے حضرتِ علامہؒ کی ایک تجویز، جس میں کہا گیا تھا کہ کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے ایک کھلے عام اجلاس میں ایک نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کر لی جائے[2] کا سہارا لے کر 'کشمیر کمیٹی' کے نام سے پھر دامِ ہمرنگ زمین بچھانا چاہا، اس کی صدارت کی پیش کش کر کے حضرتِ علامہؒ کو پھانسنا چاہا مگر انہوں نے نہایت سختی و حقارت کے اسے بھی مسترد کر دیا۔ فرمایا:

"مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصُولی اختلاف نہیں، بلکہ میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں اور میرے اس رویہ کی وجوہات وہی ہیں جن کی بنا پر میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی نئی تشکیل ہونی چاہیئے ------ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیشِ نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ

---

[1] 'حرفِ اقبالؒ'، ص ۲۰۲، لطیف احمد شروانی ایم اے

[2] 'حرفِ اقبالؒ'، ص ۲۰۳، لطیف احمد شروانی ایم اے

داری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈا کرنا ہے[1]،
اور واقعہ یہ ہے کہ یہیں سے حضرتِ علامہؒ کی قادیانیت کے خلاف کھلی کھلی لڑائی کا آغاز ہوا۔
بقول محمد احمد خاں:

"علامہ اقبالؒ نے "کشمیر کمیٹی" کے دوران قادیانیوں کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا تھا اور "کشمیر کمیٹی" کے یہ واقعات اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان ہی واقعات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قادیانی تحریک کی سختی سے مخالفت کرنی شروع کی"[2]

ذرا سے گریز کے ساتھ میں یہ کہنے کی بھی اجازت چاہوں گا کہ آیا کبھی پاکستان کے مسلمانوں نے اس امر پر غور کیا ہے کہ ہر پاک بھارت جنگ کے دوران کشمیر و قادیان سے ملحق سرحدات کی کمان قادیانی جرنیلوں ہی کے ہاتھ میں کیوں رہی ہے؛ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے سر ظفر اللہ خاں (پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ) نے حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال (جو آج کل "پنجاب ہائی کورٹ" میں جسٹس کے عہدہ پر فائز ہیں) کی معرفت اُس وقت کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں (مرحوم) کو یہ پیغام کیوں بھیجا کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کے لیے موزوں ہے۔ پاکستان کی فوج ضرور کامیاب ہو گی۔ جہاں تک ہندوستان کے ہاتھوں بین الاقوامی سرحد کے آلودہ ہونے کا تعلق ہے ایسی کوئی چیز نہ ہو گی[3] اور مشہور قادیانی جرنیل لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک (موجودہ لیفٹننٹ جنرل عبدالعلی ملک کے بڑے بھائی جو انقرہ میں کسی حادثہ میں ہلاک ہو گئے اور جن کی نعش وہاں سے لاکر "ربوہ" دفن کی گئی تھی) یہ انتہائی خواہش (کوشش) کس غرض سے تھی کہ اُس وقت کے گورنر ملک امیر محمد خان صدر ایوب کو اس بات پر آمادہ کریں کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کے لئے بہترین ہے۔ یقین ہے کہ ہم کشمیر حاصل کر پائیں گے[4] ——— صرف یہی نہیں بلکہ قادیانی "مُصلحِ موعود" کی یہ پیشگوئی بھی اُن دنوں نہایت اہتمام کے ساتھ آزاد کشمیر میں پھیلا دی گئی کہ ریاست جموں و کشمیر آزاد ہوگی

---

[1] "حرفِ اقبالؒ" صـ۲۰۲ لطیف احمد شروانی ایم اے

[2] "احرار اور تحریکِ کشمیر" صـ۱۶۱ بحوالہ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" از محمد احمد خاں

[3] "عجمی اسرائیل" صـ۳۵، آغا شورش کاشمیری [4] "عجمی اسرائیل" صـ۳۴، آغا شورش کاشمیری

اور اس کی فتح و نصرت احمدیت کے ہاتھوں ہوگی اور قادیانی اب بھی یہی پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ کشمیر قادیانی سُورماؤں ہی کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ ظاہر ہے قادیانی ایک وقت میں کئی کھیل کھیلتے ہیں۔ وُہ کسی نہ کسی دائرے میں بہرحال سیاسی اقتدار چاہتے ہیں۔ یا پھر اُنہیں سیکولر گورنمنٹ ہی برداشت کرسکتی ہے۔ بصورتِ دیگر وُہ اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قادیانی سیاست مذکورہ دوائر میں حرکت کرتی ہے۔ کشمیر پر قادیانیوں کی نظر اسی لیے ہے کہ اس طرح وُہ کشمیر میں پہلے سے موجود قادیانی اثرات سے فائدہ اُٹھا کر اپنا اقتدار قائم کرسکتے ہیں اور پھر کشمیر میں اُن کے پیغمبر کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی قبر بھی ہے[1] جسے وُہ اپنے تئیں مرزا غلام احمد کی صداقت کا ایک بڑا نشان سمجھتے ہیں۔ پھر اسی ریاست سے ہم آغوش اُن کے پیغمبر کی جائے پیدائش ہے جسے وُہ 'دارالامان' کہتے (بلدۃ الامین مکہ مکرمہ اور دارالہجرت مدینہ منورہ کا ہم پلہ بلکہ اُن سے بھی افضل قرار دیتے[2]) اور اپنی جماعت کا خدا تعالیٰ کی طرف سے ٹھہرایا ہوا دائمی مرکز سمجھتے ہیں[3]۔ اور اُن کا خیال ہے کہ مرزا غلام احمد کی پیش گوئی کے مطابق قادیان قادیانیوں کو ضرور ملے گا۔ وُہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ذہنوں میں بھی یہی بات راسخ کرتے ہیں چنانچہ 'راہِ ایمان' کے نام سے 'احمدی بچوں کے لیے ابتدائی دینی معلومات کے مجموعہ' کے صفحہ ۹۸ پر 'قادیان سے ہجرت کی پیشگوئی' کے زیرِ عنوان لکھا ہے:

> 'حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کو خُدا نے الہام اور خواب کے ذریعے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں جماعتِ احمدیہ کو قادیان سے نکلنا پڑے گا اور خشک پہاڑیوں والے ایک اُونچے علاقہ میں اسے اپنا دوسرا مرکز بنانا پڑے گا یہ حالت عارضی ہوگی آخر ایک وقت آئے گا کہ قادیان جماعتِ احمدیہ کو واپس مل جائے گا' پیشگوئی کا ایک حصہ ۱۹۴۷ء میں پُورا ہوگیا —— اور ہر احمدی کا

---

[1] 'کشتی نوح' صفحہ ۳۲ مرزا غلام احمد قادیانی

[2] 'الفضل' ۱۱ دسمبر ۱۹۳۲ء، تقریر مرزا محمود 'حقیقت الرؤیا' صفحہ ۴۶ مصنفہ مرزا محمود

[3] 'انوارِ خلافت' صفحہ ۱۱۷ مرزا محمود 'راہِ ایمان' صفحہ ۹۲ شیخ خورشید احمد قادیانی

ایمان ہے کہ پیشگوئی کا آخری حصہ بھی ضرور پورا ہو گا اور قادیان جماعت احمدیہ کو انشاء اللہ ضرور واپس ملے گا۔

قارئین خود اندازہ فرمائیں کہ یہ کس طرح ممکن ہو گا؟ کیا حیدر آباد، جوناگڑھ، مناور اور کشمیر کو ہڑپ کرنے والا بھارت قادیان دے گا؟ قادیانی بزورِ بازو فتح کریں گے؟ یا بڑی طاقتوں کی معرفت یہ پیشگوئی پوری ہو گی؟ آخر قادیان قادیانیوں کو کس طرح ملے گا؟ بہر حال قادیانیوں کے یہی وُہ سیاسی عزائم تھے جنہیں کشمیر موومنٹ نے بے نقاب کیا اور حضرتِ علامہؒ انہیں اسلام اور ملک کا غدار قرار دینے پر مجبور ہو گئے۔

۳—

قادیانی جب دلیل کے میدان میں عاجز آجاتے ہیں تو پھر یوں پینترا بدلتے ہیں:

"اپنی عمر کے آخری حصہ میں علامہ اقبال نے جماعت احمدیہ سے اختلاف کیا لیکن اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ اس کے وجوہ سیاسی تھے"[1]

وہ سیاسی وجوہ کیا تھے؟ "الفضل" لکھتا ہے:

"چودہری ظفر اللہ خان ایک خاص عہدے پر نہ لیے جاتے تو یہ تحریریں بھی ہرگز وجود میں نہ آتیں"[2]

حالانکہ جب حضرتِ علامہؒ حیات تھے تو کسی قادیانی کو اس کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ تب قادیانی جماعت کے "مصلح موعود" مرزا بشیر الدین محمود یہ توجیہہ کیا کرتے تھے:

"اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے ماتحت جماعت احمدیہ کے مخلصین کے اخلاص کو اور بھی زیادہ ظاہر کرنے کے ارادے سے نئے نئے لوگوں کو ہمارے مخالفوں کی صف میں لا کھڑا کر رہا ہے۔ پہلے احراری اٹھے ---- پھر اُمراء ---- پھر پیروں، گدی نشینوں اور اخبار نویسوں کی ایک جماعت

---

[1] احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں، مؤلفہ عبدالمالک خاں شائع کردہ نظارتِ اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ۔ [2] "الفضل" ربوہ مورخہ ۲۴ رجون ۱۹۶۷ء

- - - - - - ہندوستان کے سیاسی لیڈر ابھی تک خاموش تھے - - - اسی طرح اعلیٰ عہدہ دار خاموش تھے یا کم از کم ظاہر میں خاموش تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ طوفانِ مخالفت فرو ہونے میں نہیں آتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے تو انہوں نے کہا کہ ہم پیچھے کیوں رہیں؟ اس خیال کا آنا تھا کہ سر مرزا ظفر علی صاحب نے ایک بیان شائع کر دیا، پھر ڈاکٹر سر اقبال کو خیال آگیا کہ میں پیچھے کیوں رہوں[1]؟

گویا اُس وقت قادیانی جماعت یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی تھی کہ حضرت علامہؒ کی مخالفت دوسروں کی دیکھا دیکھی محض 'فیشن' کے طور پر ہے اور بس۔ حالانکہ یہ بات بھی درست نہیں۔ حضرتِ علامہؒ نے قادیانیت کے بارے میں جو کچھ لکھا اس میں اُن کے ذاتی تجربے، مشاہدے، مطالعے اور تجزیے کو دخل تھا۔ 'الفضل' نے جو راگنی چھیڑی ہے اُس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ چودہری محمد ظفر اللہ خاں کو (اُن کے اپنے بیان کے مطابق) ۳۲ء میں چند ماہ کے لیے عارضی طور پر سر فضل حسین نے اپنی جگہ ایگزیکٹو کا ممبر نامزد کیا۔ مستقل تقرر ۳۴ء کے اواخر میں ہوا[2] جبکہ قادیانیت کی بابت حضرت علامہؒ کے خیالات میں تبدیلی اس سے بہت پیشتر آ چکی تھی اور وہ اس تحریک سے بیزاری کا اظہار کرنے لگ گئے تھے، خود قادیانیوں کے 'قمر الانبیاء' مرزا بشیر احمد نے لکھا ہے کہ:

> ۱۸۹۱، ۹۲ء - - - - - کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے اپنے باپ کو بھی سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا[3]۔

۳۳ء میں حضرتِ علامہؒ کی مخالفت میں اگر انتہائی شدت پیدا ہوئی تو اسے اُس دور کے پس منظر بالخصوص 'تحریکِ کشمیر' کے حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ کشمیر کمیٹی کی آڑ میں قادیانیوں نے جو کچھ کیا وہ ایک حضرتِ علامہؒ کیا، سب مسلمان رہنماؤں کے لیے تشویش کا موجب تھا۔ یہی

---

[1] 'الفضل' قادیان ۳۰ رمئی ۱۹۳۵ء بحوالہ 'پنجاب کی سیاسی تحریکیں'، ص ۲۱۷ عبداللہ ملک

[2] 'تحدیثِ نعمت'، ص ۲۹۸-۲۹۹ و ص ۳۴۷ چودھری سر محمد ظفر اللہ خان

[3] 'سیرت المہدی'، ص ۲۴۹ مرزا بشیر احمد ایم اے۔

وجہ ہے کہ "تحریکِ کشمیر" کے بعد قادیانیوں کی مخالفت شدید سے شدید تر ہو گئی۔ اس میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور اپنے حقوق کے تحفظ کے احساس اور جذبے کو بھی دخل تھا۔ قادیانی جو چاہیں کہیں حقیقت یہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ظفر اللہ خاں نہ تو حضرتِ علامہؒ کے کبھی حریف رہے نہ رقیب۔ پھر حضرتِ علامہؒ ان باتوں سے ماورا قسم کے انسان تھے۔ ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت ظفر اللہ خاں کے لیے کوئی اعزاز ہو تو ہو حضرتِ علامہؒ کے نزدیک پرِکاہ کے برابر حیثیت نہ رکھتی تھی۔ حضرتِ علامہؒ نے "قادیانی فتنے" کا احتساب ۳۲ سے اپنی وفات تک برابر جاری رکھا مگر اس دوران کی کسی ایک تحریر کے کسی ایک حرف سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں سر ظفر اللہ خاں سے کوئی ذاتی پرخاش تھی یا وُہ ان کے ایگزیکٹو کا ممبر بن جانے کے باعث قادیانیت کی مخالفت تک پہنچ گئے۔ بلکہ اس کے برعکس وُہ اپنے ایک مضمون "قادیانی اور جمہور مسلمان" (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) میں لکھتے ہیں:

"اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے دُوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ توقع رکھنی بیکار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں"

اور اگر بالفرض مسلمانوں کے حقُوق پامال ہوتے دیکھ کر (کیونکہ سر ظفر اللہ خاں کو سر فضل حسین کی جگہ ایگزیکٹو کا رُکن لیا گیا تھا جو ایگزیکٹو میں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے شامل تھے) وُہ اس تقرر پر احتجاج کرتے یا قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرتے (تاکہ مسلمان کہلا کر وُہ اسلامیانِ ہند کے حقُوق سے متمتع نہ ہو سکیں) تو کیا یہ غلط ہوتا؟

بہرحال حضرتِ علامہؒ کی لڑائی اصولی تھی، ذاتی نہ تھی اور ویسے بھی وُہ گھٹیا سیاسی مفاد کی خاطر مذہب کو آڑ بنانے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے محض ملک و ملت کے بہترین مفاد کو سامنے رکھ کر قادیانیت کی مخالفت کی، اور ایسا کرنا اُن کے لیے ناگزیر تھا۔

... اب آپ جو کچھ پڑھیں گے، وُہ سب حضرتِ علامہؒ کے اپنے قلم سے ہے، ہاں متن کے ساتھ ساتھ جُملہ حواشی میرے قلم کی زیادتی ہیں۔

مرتب

باب اوّل

فلسفۂ ختمِ نبوّت

قوم را سرمایهٔ قوّت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملّت ازو

اسرار و رموز

"ختمِ نبوت کے معنٰی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے ۔۔کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وُہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا حالانکہ جیسا طبری لکھتا ہے وُہ حضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا مصدق تھا اور اُس کی اذان میں حضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی تصدیق تھی۔"

۱°

اس سے پہلے کہ ہم اپنی بحث میں آگے بڑھیں ضروری ہے کہ اسلام کے ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی تصور ـــــ میرا مطلب ہے عقیدۂ ختمِ نبوت (مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ[۱] (۳۳ : ۴۰) مترجم) کی ثقافتی قدر و قیمت پورے طور پر ذہن نشین کر لی جائے۔

ایک اعتبار سے نبوت کی تعریف یُوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ شعورِ ولایت کی وُہ شکل ہے جس میں وارداتِ اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کر جاتیں اور اُن قوتوں کی پھر سے رہنمائی یا از سرِ نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیاتِ اجتماعیہ کی صُورت گری ہیں۔ گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز (انسانی خودی۔ مترجم) اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے (اپنے مبدأ وجود سے اتصال کی بدولت۔ مترجم) تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے اُبھر سکے وُہ ماضی (یعنی انسان جس راستے پر چل رہا تھا۔ مترجم) کو مٹاتا اور پھر زندگی کی نئی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے۔ (تاکہ ایک نئی ہیئتِ اجتماعیہ کی تعمیر ہو سکے۔ مترجم) لیکن اپنی ہستی اور وجود کی اساس سے انسان کا یہ تعلق کچھ اُسی کے لیے مخصوص نہیں۔ قرآنِ مجید نے لفظِ وحی کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے، اُن سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وحی خاصۂ حیات ہے اور ایسا ہی عام جیسے زندگی۔ یہ دُوسری بات ہے کہ جُوں جُوں اس کا گزر مختلف مراحل سے ہوتا یا یُوں کہیئے کہ جیسے جیسے وُہ ارتقاء اور نشو و نما حاصل کرتی ہے ویسے ہی اس کی ماہیت اور نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ یہ کسی پودے کا زمین کی پہنائیوں میں آزادانہ سر نکالنا، یہ کسی حیوان میں ایک نئے ماحول کے مطابق کسی نئے عضو کا نشو و نما، یہ انسان کا خود اپنی ذات اور وجود میں زندگی کی گہرائیوں سے نُور اور

° یہ مضمون "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" سے اخذ کیا گیا ہے، جو حضرت علامہؒ کے اُن مایۂ ناز انگریزی خطبات کا اُردو ترجمہ ہے، جو انہوں نے 'مدراس مسلم ایسوسی ایشن' کی دعوت پر ۲۹-۱۹۲۸ء میں مدراس، حیدر آباد اور علیگڑھ میں ارشاد فرمائے۔ یہ خطبات فلسفیانہ رنگ میں اپنے موضوع پر ایک اچھوتی تخلیق ہیں۔

[۱] (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں (الاحزاب، آیت ۴۰)

روشنی حاصل کرنا، یہ سب وحی کی مختلف شکلیں ہیں۔ جو اس لیے بدلتی چلی گئیں کہ اس کا تعلق جس فرد سے تھا یا جس نوع میں اِس کا شمار ہوتا تھا اس کی مخصوص ضروریات کچھ اور تھیں۔ اب بنی نوعِ انسان کے عالمِ صغر سنی میں ایسا بھی ہوا کہ اس کی نفسی توانائی کا نشو و نما (جس کا اظہار غور و فکر ارادہ و اختیار، ادراک و تعقل، حکم، تصدیق یعنی اعمالِ ذہنی میں ہوتا ہے۔ مترجم) شعور کی وہ صورت اختیار کرلے جسے ہم نے شعورِ نبوت سے تعبیر کیا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا، نہ اُن کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ اُن کی پسند کیا ہو اور ناپسندیدگی کیا؟ اُنہیں یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے لیئے کیا راہِ عمل اختیار کریں؟ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی سے طے شدہ ہوں گی، یہ نہیں کہ اُنہیں اس بارے میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے (معروف و منکر، امر اور نہی، کی تعیین میں لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِۚ [1]) شعورِ نبوت کو گویا کفایتِ فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیئے (کیونکہ اس طرح ہمیں فرداً فرداً ان اُمور کا فیصلہ نہیں کرنا پڑتا صرف ایک فرد کا حکم اور انتخاب ہماری رہنمائی کے لیئے کافی ہوتا ہے مترجم) لیکن جہاں عقل نے آنکھ کھولی (تاکہ ذہنِ انسانی کو خود اپنی بصیرت، فہم اور تدبر سے کام لینے کا موقع ملے، یہ امر بھی منجملہ اُن مقاصد کے ہے جو نبوت کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ مترجم) اور قوتِ تنقید بیدار ہوئی تو پھر زندگی کا مفاد اسی میں ہے کہ ارتقائے انسانی کے اولین مراحل میں ہماری نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں سے ہوا تھا اُن کا ظہور اور نشو و نما رُک جائے۔ انسان جذبات کا بندہ ہے اور جبلتوں سے مغلوب رہتا ہے (جن کو اگر ٹھیک راستے پر نہ ڈالا جائے تو ایک دوسرے سے رقابت اور فسادِ اخلاق کو تحریک ہوتی ہے۔ جس کا انجام ہے ہلاکت۔ مترجم) وہ اپنے ماحول کی تسخیر کرسکتا ہے تو عقلِ استقرائی کی بدولت (جس میں وہ اصولِ علم کی بناء پر عالمِ خارجی کا مطالعہ کرتا ہے۔ مترجم) لیکن عقلِ استقرائی اس

---

[1] ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں (سورۃ الحدید آیت ۲۵)

کے اپنے حاصل کرنے کی چیز ہے۔ (تجربے اور امتحان، مشاہدے اور تحقیق و تجسس کی حدود سے مترجم) جسے ایک دفعہ حاصل کر لیا جائے تو پھر مصلحت اسی میں ہے کہ حصولِ علم کے اور جتنے بھی طریق ہیں اُن پر ہر پہلو سے بندشیں عائد کر دی جائیں تاکہ مستحکم کیا جائے تو صرفِ عقلِ استقرائی کو (عالمِ فطرت کی تسخیر اور زندگی کو واقعیت کی نظر سے دیکھنے کی خاطر۔ مترجم) اس میں کوئی شک نہیں کہ دُنیائے قدیم نے بڑے بڑے عظیم نظاماتِ فلسفہ پیدا کئے۔ (تعلیماتِ نبوت سے باہر محض حکیمانہ غور و فکر کی بدولت مثلاً ارضِ یونان یا قدیم ہندوستان میں۔ مترجم) مگر یہ اُس وقت جب انسان اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا اور اس پر ایما اور اشارے کا غلبہ تھا۔ (یعنی وُہ اپنی عقل اور سمجھ کی بجائے وہی کچھ کرنے لگتا تھا جو دوسرے کرتے تھے۔ مترجم) لہٰذا ماضی کے یہ فلسفیانہ نظامات مجرد فکر کی بنا پر مرتب ہوئے، لیکن مجرد فکر کی بنا پر ہم زیادہ سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہ مذہبی عقائد اور مذہبی روایات میں تھوڑا بہت ربط و ترتیب پیدا کر دیں۔ رہا یہ امر کہ عملی زندگی میں ہمیں جن احوال سے فی الواقع گزر کرنا پڑتا ہے۔ اُن پر قابو حاصل کیا جائے تو کیسے؟ اس کا فیصلہ فکرِ مجرد کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔ (اور یہی فی الحقیقت مسئلہ ہے زندگی کا خواہ اس میں کوئی بھی راستہ اختیار کیا جائے۔ مترجم) اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آتے گا جیسے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دُنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے (جس کا ظہور آپ کی تعلیمات کی بدولت ہوا۔ مترجم) بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دُنیائے قدیم سے ہے (جس کی آپ نے رہنمائی کی۔ مترجم) لیکن بہ اعتبار اس کی رُوح کے دُنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وُہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے (یعنی جن کی زندگی کو رہنمائی کے لئے ضرورت تھی۔ مترجم) لہٰذا اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا، استقرائی عقل کا ظہور ہے۔

اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وُہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ (جیسا کہ

تعلیماتِ قرآنی کا مقصود بھی ہے۔ (مترجم) یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ کو علمِ انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ اِن سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے۔ (کہ انسان اپنے وسائل سے کام لے، اس کے قوائے فکر و عمل بیدار رہیں اور وُہ اپنے اعمال و افعال کا آپ جواب دِہ ٹھہرے۔ مترجم) کیونکہ یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیاتِ انسانی اب وارداتِ باطن سے، جو باعتبارِ نوعیت (ان معنوں میں کہ اس کا تعلق ادراک بالحواس سے نہیں۔ مترجم) انبیاء کے احوال و واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لیئے محروم ہو چکی ہے۔ قرآنِ مجید نے آفاق و اَنفُس[1] دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کا ظہور محسوسات و مُدرِکات (محسوسات، یعنی ہماری وارداتِ شعور، ہمارے داخلی احوال اور تجربات اور مُدرِکات، یعنی ہمارے وُہ مشاہدات جن کا تعلق عالمِ فطرت کے مطالعہ سے ہے۔ مترجم) میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دُنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصولِ علم میں کہاں تک مدد مِل سکتی ہے (لہٰذا اس کی تنقید لازم ٹھہری۔ مترجم) ماحصلِ کلام یہ کہ تصورِ خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے، جذبات کے لیئے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے، نہ ہونی چاہیئے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ واردات باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہرحال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں، اس لیئے کہ اگر ہم نے ختمِ نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے

---

[1] حضرت علامہ نے انگریزی میں "آفاق و اَنفُس" کا مرادف Self and world لکھا ہے۔ ملاحظہ

'The Reconstruction of Religious Thought in Islam,'

Page 120. By Sir Muhammad Iqbal II Edition 1934.

سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دُنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کُھل جائیں۔ (اور ہم اُن کا مطالعہ عقل و فکر اور تعلیمات نبوت کی روشنی میں کریں۔ مترجم) بعینہٖ جس طرح اسلامی کلمہ (لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ مترجم) کے جزوِ اوّل نے انسان کے اندر یہ نظر پیدا کی کہ عالمِ خارج کے متعلق اپنے محسوسات و مدرکات (بالفاظِ دیگر مظاہرِ فطرت یا قُوائے طبیعیہ۔ مترجم) کا مطالعہ نگاہِ تنقید سے کرے اور قُوائے فطرت کو الُوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے۔ (یعنی ان کو دیوی دیوتا تصور نہ کرے۔ مترجم) جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا دستور تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ اُن کی حیثیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسے اپنی دُوسری واردات اور اس لیئے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طرزِ عمل بھی یہی تھا[1]

---

[1] تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص۱۹۰ مترجمہ سید نذیر نیازی۔ شائع کردہ بزمِ اقبال، لاہور

۵۲

یقین کیجئے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے نزدیک اِن بنیادی تصورات کی اَساس چونکہ وحی و تنزیل پر ہے، جس کا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔ لہٰذا وُہ اپنی ظاہری خارجیت (بمقابلہ ہماری ذات کے۔ مترجم) کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے۔ (کیونکہ اس سے درحقیقت ہماری فطرت ہی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ[1]۔ مترجم) ہمارے لیے تو زندگی کی رُوحانی اَساس ایمان و یقین کا معاملہ ہے، جس کی خاطر ایک غیر تعلیم یافتہ مسلمان بھی برضا و رغبت اپنی جان دے دے گا۔ پھر اسلام کے اس بنیادی تصور کے پیشِ نظر کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے، لہٰذا اب کوئی ایسی وحی نہیں کہ ہم اُس کے مکلّف ٹھہریں۔ ہماری جگہ دُنیا کی اُن قوموں میں ہونی چاہیئے جو روحانی اعتبار سے سب سے زیادہ استخلاص حاصل کر چکی ہیں۔ (ہماری جگہ سب سے زیادہ استخلاص یا نجات یافتہ قوموں میں ہونی چاہیئے۔ یعنی بحالتِ موجودہ۔ لیکن ہم خود سب سے زیادہ 'استخلاص یافتہ' قوم ہیں، یعنی روحانی اعتبار سے جو آزادی اور حُریّت ہمیں حاصل ہے اور کسی قوم کو حاصل نہیں اور یہی فی الحقیقت حضرتِ علامہؒ کا مطلب بھی ہے۔ مترجم) شروع شروع کے مسلمانوں کو جنہوں نے ایشیائے قبل۔ اسلام کی روحانی غلامی سے نجات حاصل کی تھی اسلام کے اس بُنیادی تصور (خاتمیت۔ مترجم) کی ٹھیک ٹھیک حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے۔ لیکن ہمیں چاہیئے آج اپنے اس مَوقِف کو سمجھیں (کہ بابِ نبّوت ہر نوع اور ہر جہت سے مسدُود ہے۔ مترجم) اور اپنی حیاتِ اجتماعیہ کی ازسرِ نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں، تاآنکہ اس کی وُہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جُزوًا ہمارے سامنے آئی ہے، یعنی اُس رُوحانی جمہُوریت کا نشو و نما جو اس کا مقصود و منتہا ہے، تکمیل کو پہنچ سکے۔

---

۵ یہ اقتباس بھی تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ سے لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور کا ص ۲۷۶

[1] اگر تم جانو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ سورۃ الصف آیت ۱۱

Dr. Sir Mohd. Iqbal, Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore

Dated ______ 193

مسئلہ ختمِ نبوت پر حضرتِ علامہؒ کی ایک تاریخی تحریر کا عکس (۱)

سے یا ان جیسے مضمونوں سے نجات ہو جائے

اور لطف یہ کہ یہی [illegible] نہ [illegible]

بلکہ آزادی ہے کیونکہ اس کا نتیجہ اسلام دین فطرت بھی

یعنی فطرت صحیحہ اس کو خود بخود قبول کرتی ہے ۔ فطرت صحیحہ کا

اس کو خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے

پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے عین فطرت ہیں ایسے احکام [illegible] جگہ

ایک مطلق الفاظ میں قرآن نے ہم پر عائد کر دیا ہے اور جن پر بغیر خوف کے عمل کرنے پر

مجبور ہیں ۔ اسلام کو دین فطرت کہہ کر Realise کرنے کا تمام [illegible] سے

اور ایک [illegible] فرض [illegible] ہے کہ ہر ایک کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے

اس کیفیت کو اپنے لفظ manifestation سے تعبیر کیا ہے ۔ [illegible]

محمد اقبال

[illegible] انگریزی [illegible]

[illegible] انگریزی و [illegible] ہو جائے گا ۔

۳۰

راجہ صاحب کا مضمون میں نے نہیں دیکھا۔ دیکھا تو تھا پڑھا نہیں۔ آپ اپنے مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔ اُن کے خیالات کی تردید ضروری نہیں۔

نبوّت کے دو اجزاء ہیں:

(۱) خاص حالات و واردات، جن کے اعتبار سے نبوت روحانیت کا ایک مقامِ خاص تصوّر کی جاتی ہے۔ (مقام تصوّفِ اسلام میں ایک اصطلاح ہے۔)

(۲) ایک Socio-Political Institution قائم کرنے کا عمل یا

○ نمبر ۳، ۴ کے ذیل میں دی گئی تحریریں ۱۹۳۵ء میں حضرتِ علامہؒ نے سیّد نذیر نیازی، تب ایڈیٹر مطلوعِ اسلام (دہلی) کے نام لکھیں۔ ان کا شانِ نزول خود اُنہی کی زبانی سُنیئے:

"...... (ان) کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ۳۵ء میں 'انجمن احمدیہ اشاعتِ اسلام' لاہور کے انگریزی ہفت روزہ 'لائٹ' نے بلاوجہ حضرتِ علامہؒ کے انگریزی خطبات بالخصوص پانچویں خُطبے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ جو حضرت علامہؒ کہتے ہیں کہ بابِ نبوّت مسدود ہے یہ دراصل مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ حضرتِ علامہؒ نے کہیں 'عقلِ استقرائی' کا ذکر کر دیا تھا۔ مُدیرِ لائٹ، اس کا صحیح مفہوم تو سمجھ نہ سکے۔ انہوں نے فرمایا یہ دیکھئے اقبالؒ عقل کو نبوت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ مغرب زدگی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ مضمون شائع ہوا تو راجہ حسن اختر صاحب نے انگریزی زبان ہی میں مدیرِ 'لائٹ' کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں اُن کے غلط خیال کی تردید بڑے معقول طریقے سے کی گئی تھی۔ اتفاق سے لاہور میں راجہ صاحب سے 'لائٹ' کے اس مضمون کا ذکر آ گیا۔ میں نے عرض کیا یہ پرچہ چونکہ ایک انجمن کا ہے۔ جس کی ایک مخصوص دعوت ہے لہٰذا مجھے اس کا ترجمہ اُردو میں شائع کر دینا چاہیئے۔ حضرتِ علامہؒ نے بھی اس خیال سے اتفاق فرمایا۔ پھر جب ضمناً بعض دوسرے مسائل کی وضاحت ضروری نظر آئی اور میں نے حضرت علامہ سے اس بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے ازراہِ عنایت (یہ) دو تحریریں مرحمت فرمائیں، (مکتوباتِ اقبالؒ صفحہ ۳۰، مرتبہ سیّد نذیر نیازی) یہ طویل اقتباس صرف اس لیئے درج کیا گیا ہے تاکہ آپ ان تحریروں کے پس منظر سے پُوری طرح آگاہ ہو سکیں۔

اس کا قیام۔ اس Institution کا قیام گو ایک نئی اخلاقی فضا کی تخلیق ہے۔ جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمالات تک پہنچتا ہے۔ اور جو فرد اس نظام کا ممبر نہ ہو یا اس کا اِنکار کرے وُہ ان کمالات سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں کُفر کہتے ہیں۔ گویا اس دُوسری جُزو کے اعتبار سے نبی کا مُنکر کافر ہے۔

دونوں اجزاء موجود ہوں تو نبوت ہے۔ صرف پہلا جُزو موجود ہو تو تصوفِ اسلام میں اس کو نبوت نہیں کہتے۔ اس کا نام ولایت ہے۔

ختمِ نبوت کے معنیٰ یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مُسیلمہ کذّاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا حالانکہ طبری[1] لکھتا ہے وُہ رسالتماب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا مصدق تھا۔ اور اس کی اذان میں حضور رسالتماب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی تصدیق تھی[2]

لیڈنگ سٹرنگز Leading Strings سے مراد لیڈنگ سٹرنگز آف ریلیجن نہیں بلکہ

○ خط کشیدہ الفاظ میں دی گئی یہ عبارت وہی ہے جسے بشیر احمد صاحب ڈار نے اپنی کتاب "انوارِ اقبال" میں حذف کر دیا ہے۔ جبکہ علامہ مرحوم کی تحریر کے عکسی متن میں یہ موجود ہے اور صاف پڑھی جاتی ہے۔

[1] ابی جعفر محمد بن جریر الطبری، تیسری صدی ہجری کے مایہ ناز مُسلمان مورخ، محدث اور مفسر۔

[2] علامہ طبری کے الفاظ یہ ہیں: "کَانَ یُؤَذِّنُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَیَشْھَدُ فِی الْاَذَانِ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَکَانَ الَّذِیْ یُؤَذِّنُ لَہٗ عَبْدُ اللّٰہِ ابْنُ النَّوَاحَۃَ وَکَانَ الَّذِیْ یُقِیْمُ لَہٗ حُجَیْرُ ابْنُ عُمَیْرٍ وَیَشْھَدُ لَہٗ وَکَانَ مُسَیْلِمَۃُ اِذَا دَنَا حُجَیْرٌ مِّنَ الشَّھَادَۃِ قَالَ صَرِّحْ حُجَیْرُ فَیَزِیْدُ فِیْ صَوْتٍ وَّیُبَالِغُ التَّصْدِیْقَ نَفْسَہٗ" (تاریخ طبری، ج ۳ ص ۲۴۴) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذان دیتا تھا کہ محمد — اللہ کے رسول ہیں۔ (مسیلمہ کے لیے) اذان عبداللہ بن النواحہ دیتا اور اقامت حجیر بن عمیر کہتا اور جب حجیر شہادت کے قریب پہنچتا تو مسیلمہ کہتا اے حجیر خوب زور سے کہو (یعنی شہادت کو بلند آواز سے کہو تا کہ لوگوں کو اچھی طرح سُنائی دے) پس حجیر آواز کو بلند کرتا، اس طرح مسیلمہ اپنی تصدیق میں مبالغہ کرتا۔

[3] یہ اشارہ ہے حضرتِ علامہ کے پانچویں لیکچر کے اس جملہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر

لیڈنگ سٹرنگز آف فیوچر پرافٹس آف اسلام ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ایک کامل الہام و وحی کی غلامی قبول کر لینے کے بعد کسی اور الہام اور وحی کی غلامی حرام ہے۔ بڑا اچھا سودا ہے کہ ایک کی غلامی سے باقی سب غلامیوں سے نجات ہو جائے اور لطف یہ کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غلامی، غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے۔ کیونکہ اُس کی نبوت کے احکام دینِ فطرت ہیں، یعنی فطرتِ صحیحہ ان کو خود بخود قبول کرتی ہے۔ فطرتِ صحیحہ کا انہیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس واسطے عین دینِ فطرت ہیں۔ ایسے احکام نہیں جن کو ایک مطلق العنان حکومت نے ہم پر عائد کر دیا ہے اور جن پر ہم محض خوف سے عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلام کو دینِ فطرت کے طور پر Realise[1] کرنے کا نام تصوف ہے۔ اور ایک اخلاص مند مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وُہ اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کیفیت کو میں نے لفظ Emancipation[2] سے تعبیر کیا ہے۔

محمد اقبال[3]

زندگی بسر نہیں کر سکتا 'Life can not for ever be kept in leading strings.'

('The Reconstruction of Religious Thought in Islam' Page 120.

By Sir Muhammad Iqbal).

[1] ثابت

[2] نجات

[3] 'انوارِ اقبال' صفحہ ۵۲ مرتبہ بشیر احمد ڈار شائع کردہ 'اقبال اکادمی' کراچی

۴

(۱) عقل اور وحی کا مقابلہ یہ فرض کرکے کہ دونوں علوم کے مَواخذ ہیں درست نہیں ہے۔ علوم کے کے مَواخذ انسان کے حواسِ اندرونی وبیرونی ہیں۔ عقل اِن حواسِ ظاہری ومعنوی کے انکشافات کی تنقید کرتی ہے اور یہی تنقید اس کا حقیقی Function[1] ہے اور بس۔ مثلاً آفتاب مشرق سے طلوع کرتا ہے اور مغرب کی طرف حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ حواسِ ظاہری کا انکشاف ہے۔ عقل کی تنقید کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حواس کا انکشاف درست نہ تھا۔

(۲) وحی کا Function[1] حقائق کا انکشاف ہے یا یوں کہیئے کہ وحی تھوڑے وقت میں ایسے حقائق کا انکشاف کر دیتی ہے جن کو مشاہدہ برسوں میں بھی نہیں کر سکتا۔ گویا وحی حصولِ علم میں جو Time[2] کا عُنصر ہے اس کو خارج کرنے کی ایک ترکیب ہے۔ انسان کی ترقی کے ابتدائی مَراحل میں اس ذریعۂ علم کی بے انتہا ضرورت تھی کیونکہ ان مَراحل میں انسان کو اُن مقامات کے لیئے تیار کیا جا رہا تھا جن پر پہنچ کر وُہ قُوائے عقلیہ کی تنقید سے خود اپنی محنت سے علم حاصل کرے۔ **مُحَمّدِ عَرَبی** (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش انسانی ارتقار کے اُس مرحلے پر ہوئی جبکہ انسان کو استقرائی علم سے رُوشناس کرانا مقصود تھا۔ میرے عقیدہ کی رُو سے بعد وحیِ محمدی کے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ سلسلہ تو الہام کا جاری ہے، مگر الہام بعد وحیِ محمدی حجت نہیں۔ سوائے اِس کے کہ ہر شخص کے لیئے جس کو الہام ہوا ہو۔ بالفاظِ دیگر بعد وحی محمدی الہام ایک پرائیویٹ Fact[3] ہے۔ اس کا کوئی سوشل[4] مفہوم یا وُقعت نہیں ہے۔

میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ نبوت کی دُوسری حیثیت ایک -Socio

---

[1] منشا، غرض وغایت

[2] وقت

[3] کسی ایک ذات سے تعلق رکھنے والی حقیقت۔

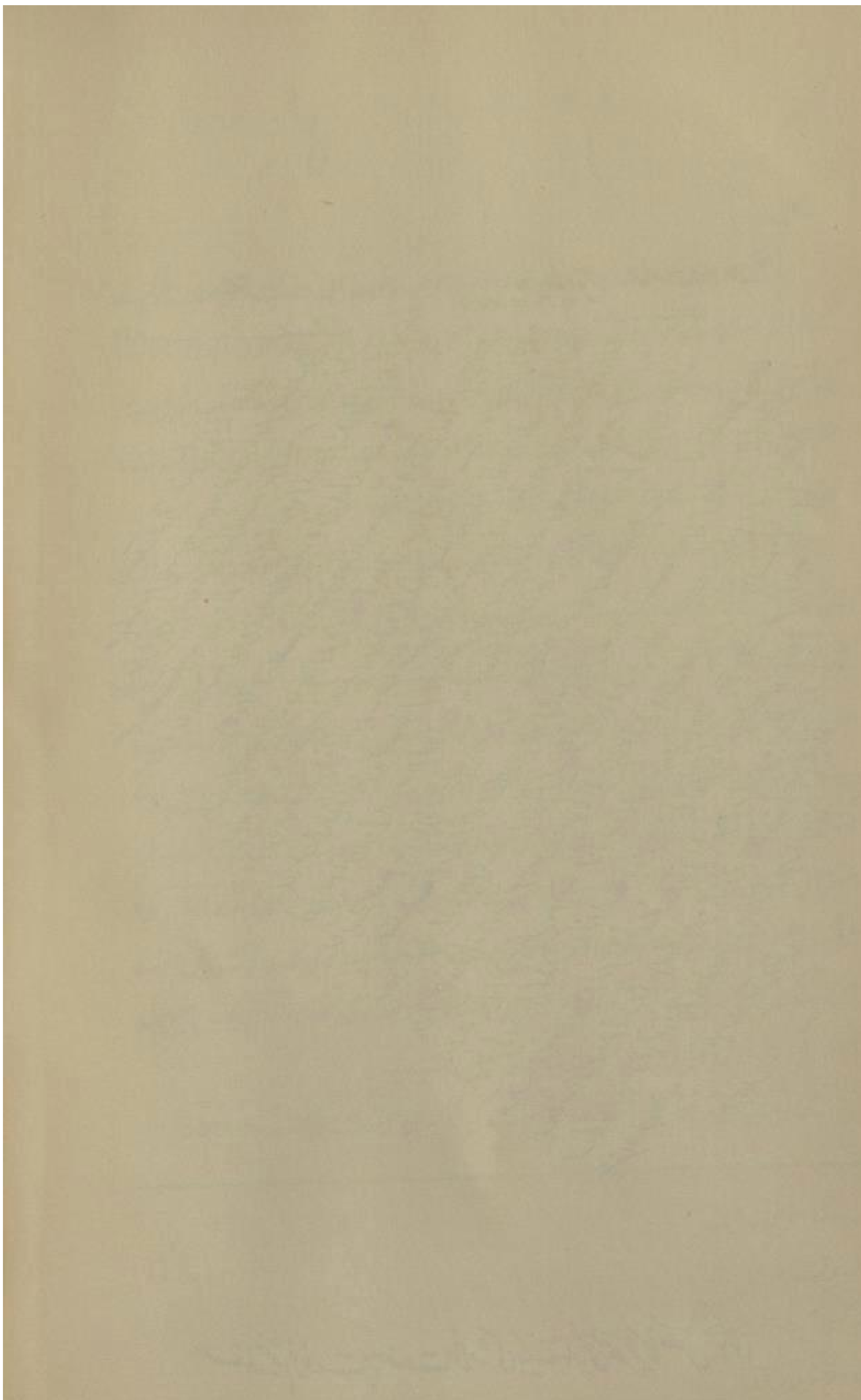
[4] معاشرتی وسماجی

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister at Law

Lahore

Dated ____________ 193

مسئلہ ختمِ نبوت پر حضرت علامہؒ کی ایک تاریخی تحریر کا عکس (۲)



Political Institution[1] کی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ بعدِ وحی محمدی کسی کا الہام یا وحی ایسے Institution[2] کی بنا، قرار نہیں پاسکتا۔ تمام صوفیۂ اسلام کا یہی مذہب ہے۔ محی الدین عربی[3] تو الہام پانے والے کو نبی کہتے ہی نہیں، اس کا نام ولی رکھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام سے پہلے بنی نوعِ انسان میں شعورِ ذات کی تکمیل نہ ہوئی تھی۔ اسلام نے انسان کی توجہ علومِ استقرائی کی طرف مبذول کی تاکہ انسانی فطرت فی کلِّ الوجود کامل ہو اور اپنی ذاتی محنت سے حاصل کردہ علم کے ذریعہ سے انسان میں اعتماد علی النفس پیدا ہو۔ غرضیکہ بعد وحی محمدی میرے عقیدہ کی رو سے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ جس شخص کو ہوتا ہے اس کے لیے حجت ہو تو ہو، اوروں کے لیئے نہیں ہے۔ اگر آج کوئی شخص کہے کہ میں نے بالمشافہ حضور رسالتماب (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مل کر دریافت کیا ہے کہ فلاں ارشاد جو محدثین آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں، آپ کا ہے یا نہیں؟ اور مجھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا ہے کہ نہیں، تو ایسا مکاشفہ اس شخص کے لیئے حجت ہوگا، تمام عالمِ اسلام کے لیئے نہیں۔ اگر اس قسم کے مکاشفات کو تمام عالمِ اسلام کے لیے حجت قرار دیا جائے تو عام تنقیدی تاریخ کا خاتمہ ہو جاتا ہے یا بالفاظِ دیگر روایت و درایتِ استقرائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

محمد اقبال[4]

---

[1] سماجی و سیاسی مکتبِ فکر

[2] مکتبِ فکر

[3] شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربیؒ اسلامی اُندلس کے ایک مشہور صوفی بزرگ جو چھٹی صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔

[4] "انوارِ اقبال" ص۴۷ مرتبہ بشیر احمد ڈار

٥

پس خُدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایّام را
اُو رُسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
داد مارا آخریں جامے کہ داشت
لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مُصطفٰےؐ است
قوم را سرمایۂ قوّت ازُو
حفظِ سرِ وحدتِ مِلّت ازُو
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا اَبد اسلام را شیرازہ بست

دل ز غیر اللہ مُسلماں بر کُند
نعرۂ لَا قَوْمَ بَعْدِیْ می زَنَد

---

٥ یہ نظم حضرتِ علامہ کی مشہور مثنوی "رمُوزِ بے خودی" سے لی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو مجموعہ "اسرار و رمُوز" صفحہ ۱۱۸

ترجمہ:°

(۱) خدا تعالیٰ نے ہم پر شریعت اور ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر رسالت ختم کر دی۔

(۲) ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر سلسلۂ انبیا، اور ہم پر سلسلۂ اقوام تمام ہو چکا، اب بزم جہاں کی رونق ہم سے ہے۔

(۳) میخانۂ شرائع کا آخری جام ہمیں عطا فرمایا گیا، قیامت تک ساقی گری کی خدمت اب ہم ہی انجام دیں گے۔

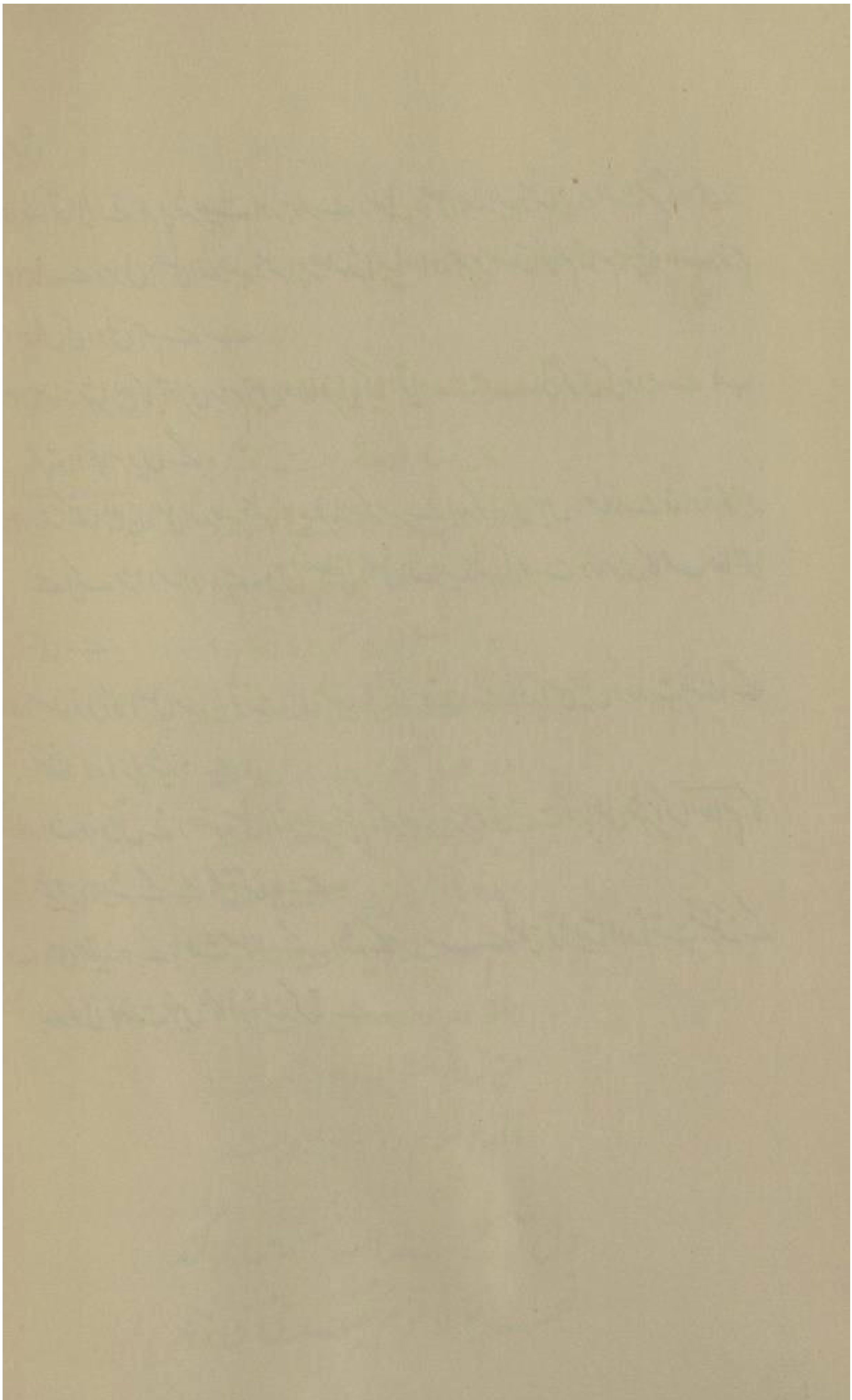
(۴) رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا یہ فرمان کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ احسانات خداوندی میں سے ایک بڑا احسان ہے۔ دینِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی عزت و ناموس کا محافظ بھی یہی ہے۔

(۵) مسلمانوں کا اصل سرمایۂ قوت یہی عقیدۂ ختمِ نبوت ہے اور اسی میں وحدتِ ملّت کے تحفظ کا راز پوشیدہ ہے۔

(۶) اللہ عزّ وجلّ نے (حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد) ہر دعویٰ نبوت کو باطل ٹھہرا کر اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے مجتمع کر دیا ہے۔

(۷) اسی عقیدہ کے باعث مسلمان ایک اللہ کے سوا سب سے تعلق توڑ لیتا اور 'امتِ مُسلمہ کے بعد کوئی امت نہیں'، کا نعرہ بلند کرتا ہے۔

° ترجمہ از مرتب



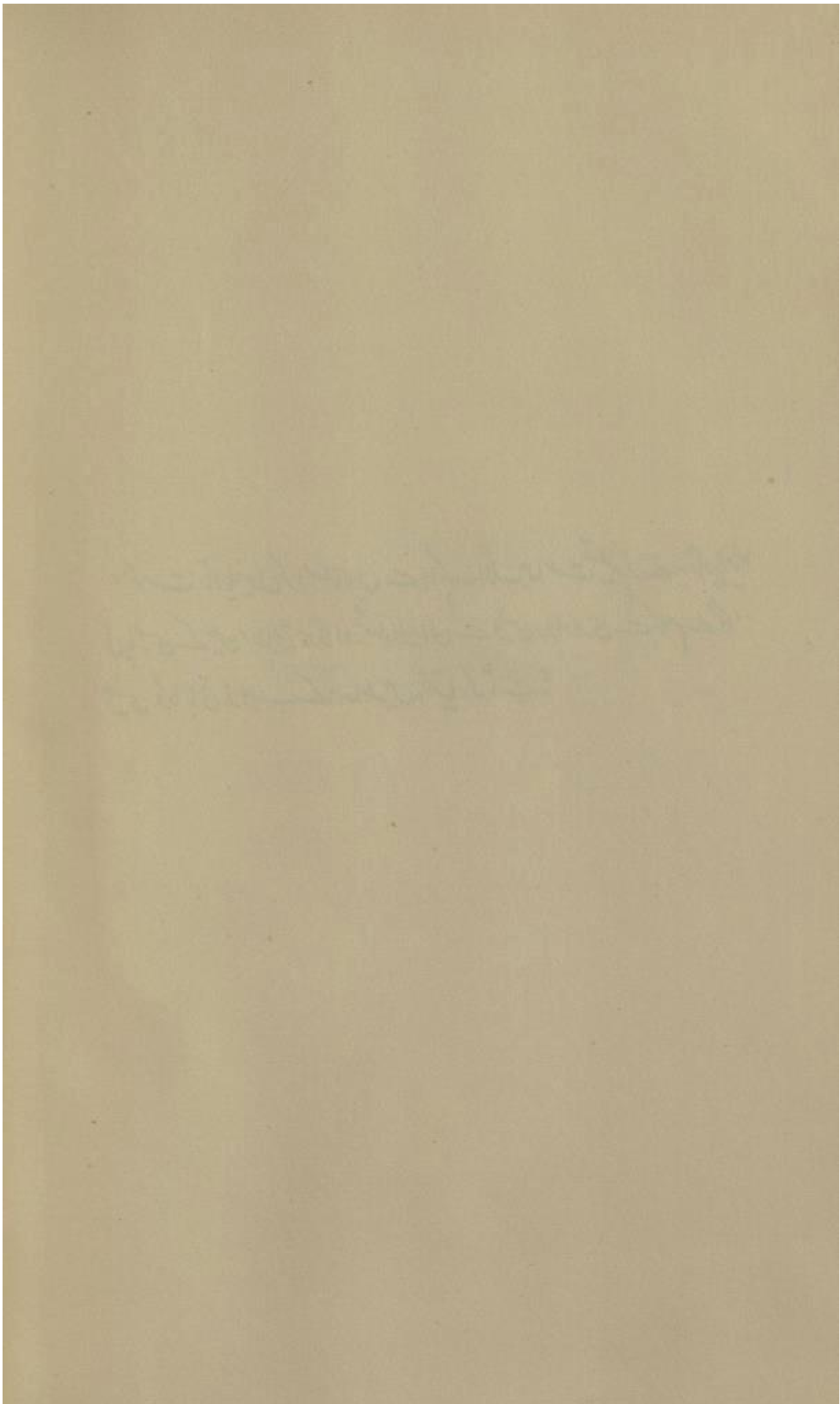
باب دوم

فتنۂ قادیانیت اور مضامینِ اقبالؒ

محکوم کے اِلہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صُورتِ چنگیز!

(ضربِ کلیم)

"حکومت، قادیانیوں کو (مسلمانوں سے) ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مُسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا، جیسی وُہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔"



قادیانی اور جمہور مسلمان°

قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کی نزاع نے نہایت اہم سوال پیدا کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حال ہی میں اس کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ انگریز قوم کو ایک کھلی چٹھی کے ذریعہ اس مسئلہ کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کروں۔ لیکن افسوس کہ صحت نے ساتھ نہ دیا البتہ ایک ایسے معاملہ کے متعلق جو تمام ہندی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی سے وابستہ ہے۔ میں نہایت مسرت سے کچھ عرض کروں گا۔ لیکن میں آغاز ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی مذہبی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں قادیانی تحریک کے بانی[1] کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لیئے کچھ دلچسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لیئے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔

ہندوستان کی سرزمین پر بے شمار مذاہب بستے ہیں۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے۔ کیونکہ ان مذاہب کی بنا کچھ حد تک مذہبی ہے اور

° حضرتِ علامہ نے یہ بیان مئی ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفاء کے بعد یہ بیان، حضرتِ علامہ کی طرف سے قادیانیت کے خلاف کھلا ہوا اعلانِ جنگ تھا۔ یہی وہ بیان ہے جس نے ایوانِ قادیانیت کے در و بام کو ہلا کر رکھ دیا اور قادیانی جتھے پر پورے پنجاب میں بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ اس بیان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے تقریباً تمام قابلِ ذکر انگریزی، اُردو اخبارات نے اسے شائع کیا اور اکثر و بیشتر نے اس پر آرٹیکل لکھے (مکتوباتِ اقبال صفحہ ۲۱۳ مرتبہ سید نذیر نیازی) خود حضرتِ علامہؒ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "یہ بیان) قریباً تمام انگریزی اخباروں میں شائع ہوا۔ ایسٹرن ٹائمز (لاہور) ٹربیون (لاہور) سٹیٹسمین (دہلی) سٹار آف انڈیا، کلکتہ علاوہ ان کے اُردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔" (مکتوباتِ اقبال، صفحہ ۲۷۲ مرتبہ سید نذیر نیازی شائع کردہ اقبال اکادمی کراچی)

[1] مرزا غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸ء ـــــ ۴۰-۱۸۳۹ء) سن پیدائش مرزا غلام احمد کی $\frac{20\times30}{16}$ سائز کی خود

ایک حد تک نسلی۔ اِسلام نسلی تخیّل کی سراسر نفی کرتا ہے اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیّل پر رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے اس لیئے وُہ سراپا روحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف بھی ہے۔ اسی لیے مسلمان اُن تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حسّاس ہے جو اُس کی وحدت کے لیئے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بِنا نئی نبوّت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اُسے اسلام کی وحدت کے لیئے خطرہ تصوّر کرے گا اور یہ اس لیئے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوّت سے ہی اُستوار ہوتی ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں غالباً ختمِ نبوّت کا تخیّل سب سے انوکھا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے مُوبدانہ تمدّن کی تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ مُوبدانہ تمدّن میں زرتشتی، یہودی، نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں۔ ان تمام مذاہب میں نبوّت کے اجراء کا تخیّل نہایت لازم تھا، چنانچہ ان پر مستقل انتظار کی کیفیت رہتی تھی۔ غالباً یہ حالتِ انتظار نفسیاتی خط کا باعث تھی۔

عہدِ جدید کا انسان رُوحانی طور پر مُوبد سے بہت زیادہ آزاد منش ہے۔ مُوبدانہ رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پُرانی جماعتیں ختم ہوتیں اور اُن کی جگہ مذہبی عیار نئی جماعتیں لا کھڑی کرتے۔ اسلام کی جدید دُنیا میں جاہل اور جوشیلے مُلّا نے پریس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے قبل اسلامی نظریات کو بیسویں صدی میں رائج کرنا چاہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام، جو تمام جماعتوں کو ایک رسّی میں پرونے کا دعوٰی رکھتا ہے۔ ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لیئے مزید افتراق کا باعث بنے۔

اس سے قبل اسلامی مُوبدیت نے حال ہی میں جن دو صورتوں میں جنم لیا ہے میرے نزدیک اُن میں بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وُہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن مؤخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری

نوشت سوانح حیات' کے صد۱۲ سے اخذ کیا گیا ہے۔

طور پر قائم رکھتی ہے۔[1] لیکن باطنی طور پر اسلام کی رُوح اور مقاصد کے لیئے مُہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصوّر کہ جس کے پاس دُشمنوں کے لیئے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں، اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجُوع ہے رُوحِ مسیح کا تسلسل یہودی باطنیت کا جزو ہے۔ پولی مسیح بال شیم Beal Shem کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر بوبر Buber کہتا ہے کہ مسیح کی رُوح پیغمبروں اور صالح آدمیوں کے واسطے سے زمین پر اُتری' اسلامی ایران میں مُوبدانہ اثر کے ماتحت مُلحدانہ تحریکیں اُٹھیں اور اُنہوں نے بروز، حلوُل اور ظِل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسُخ کے اس تصوّر کو چُھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیئے لازم تھا کہ وُہ مُسلم قلوُب کو ناگوار نہ گزریں۔ حتیٰ کہ مسیحِ موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں، بلکہ اجنبی ہے اور اس کا آغاز بھی اسی مُوبدانہ تصوّر میں مِلتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں مِلتی۔ اس حیرت انگیز واقعہ کو پروفیسر ونسنک Wensinck نے اپنی کتاب موسُومہ 'احادیث میں ربط' میں نُمایاں کیا ہے۔ یہ کتاب احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کے تین اوّلین تاریخی شواہد پر حاوی ہے۔ اور یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ اسلاف نے اس اصطلاح کو کیوں استعمال نہیں کیا؟ یہ اصطلاح اُنہیں غالباً اس لیئے ناگوار تھی کہ اس سے تاریخی عمل کا غلط نظریہ قائم ہوتا تھا۔ خاکی ذہن وقت کو مُدوّر حرکت تصوّر کرتا تھا۔ صحیح تاریخی عمل کو بحیثیت ایک تخلیقی حرکت کے ظاہر کرنے کی سعادت عظیم مسلمان مفکر اور مورّخ یعنی

---

[1] ایسا مرف اس لیئے ہے کہ شکر چڑھا زہر Sugar coated pills مُسلمان آسانی کے ساتھ نِگل سکیں۔ یہ بالکل وہی تکنیک ہے جو بقول حضرتِ علاّمہؒ مُوبدانہ اثر کی بدولت ایران میں پیدا ہونے والی مُلحدانہ تحریکوں نے اختیار کی۔ انہوں نے بھی یہودیوں کے عقیدۂ تناسُخ کو مشرّف با اسلام کرنے کے لیئے اس کو بروز، حلوُل اور ظِل وغیرہ کا نام دیا اور ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیئے لازم تھا کہ وُہ مُسلم قلوُب کو ناگوار نہ گزریں۔

ابنِ خلدون کے حصہ میں تھی۔

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدتِ احساس کا ثبوت دیا ہے وُہ جدید اجتماعیات کے طالبِ علم پر واضح ہے۔ عام مسلمان جسے پچھلے دِن سول اینڈ ملٹری گزٹ، میں ایک صاحب نے "مُلّازدہ" کا خطاب دیا تھا، اس تحریک کے مقابلہ میں حفظِ نفس کا ثبوت دے رہا ہے۔ اگرچہ اسے ختمِ نبوت کے عقیدہ کی پوری سمجھ نہیں۔ نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختمِ نبوت کے تمدنی پہلُو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے انہیں حفظِ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔ بعض ایسے ہی نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دیا ہے۔ اگر سر ہربرٹ ایمرسن[1] مسلمانوں کو رواداری کا مشورہ دیں تو میں انہیں معذور سمجھتا ہوں کیونکہ موجودہ زمانے کے فرنگی کے لیئے جس نے بالکل مختلف تمدن میں پرورش پائی ہو، اس کے لیئے اتنی گہری نظر پیدا کرنی دُشوار ہے کہ وُہ ایک مختلف تمدن رکھنے والی جماعت کے اہم مسائل کو سمجھ سکے۔

ہندوستان میں حالات بہُت غیر معمولی ہیں۔ اس ملک کی بے شمار مذہبی جماعتوں کی بقا اپنے استحکام کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیونکہ جو مغربی قوم یہاں حکمران ہے، اُس کے لیئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مذہب کے معاملہ میں عدم مداخلت سے کام لے۔ اس پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بدقسمتی سے بہُت بُرا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلم جماعت کا استحکام اس سے کہیں کم ہے جتنا حضرت مسیح (علیہ السلام) کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت تھا۔ ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مُدّعی اُسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دِلا دے اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعرِ عظیم اکبر نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا، جب اُس نے اپنے مزاحیہ

---

[1] تب گورنر پنجاب

انداز میں کہا ؎

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

میں قدامت پسند ہندوؤں کے اس مطالبہ کے لیے پوری ہمدردی رکھتا ہوں جو انہوں نے نئے دستور میں مذہبی مصلحین کے خلاف پیش کیا ہے[1]۔ یقیناً یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پہلے پیش ہونا چاہیئے تھا۔ جو ہندوؤں کے برعکس اپنے اجتماعی نظام میں نسلی تخیل کو دخل نہیں دیتے۔ حکومت کو موجودہ صورتِ حال پر غور کرنا چاہیئے۔ اور اس معاملہ میں جو قومی وحدت کے لیے اشد اہم ہے، عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اُس کے لیے اس کے سوا چارہ کار نہیں رہتا کہ وُہ معاندانہ قوتوں کے خلاف مدافعت کرے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے؟ اور وُہ طریقہ یہی ہے کہ اصل جماعت جس شخص کو تلعّب بِالدِّین کرتے پائے اُس کے دعاوی کو تحریر و تقریر کے ذریعہ جھٹلایا جائے پھر کیا یہ مناسب کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ اُس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پُوری اجازت ہو اگرچہ وُہ تبلیغ اور دُشنام سے لبریز ہو[2]۔

اگر کوئی گروہ، جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے، حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اُس کی خدمات کا صلہ دینے کی پُوری طرح مجاز ہے۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن یہ توقع رکھنی بیکار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اُس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔ اس مقام پر یہ دُہرانے کی غالباً

---

[1] ہندوؤں کو بھی اپنی وحدت کی بقا کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا۔

[2] قرائن سے معلوم ہوتا ہے اس مقام پر حضرتِ علامہ اُن پابندیوں کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں جو اُس وقت کی انگریزی حکومت نے قادیانیوں کی مخالفت کرنے پر مولانا ظفر علی خان، اُن کے اخبار 'زمیندار' اور جماعتِ احرار پر عائد کر دی تھیں۔

ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے بیشمار فرقوں کے مذہبی تنازعوں کا اُن بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا جن مسائل پر سب فرقے متفق ہیں۔ اگرچہ وُہ ایک دوسرے پر الحاد کے فتوے ہی دیتے ہوں۔

ایک اور چیز بھی حکومت کی خاص توجہ کی محتاج ہے۔ہندوستان میں مذہبی مدعیوں کی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے ہیں اور بالآخر مذہب کے اہم عُنصر کو اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ہندوستانی دماغ ایسی صُورت میں مذہب کی جگہ کوئی اور بدل پیدا کرے گا،جس کی شکل روس کی دُہری مادیت سے ملتی جُلتی ہو گی۔لیکن پنجابی مسلمانوں کی پریشانی کا باعث محض مذہبی سوال نہیں ہے،کچھ جھگڑے سیاسی بھی ہیں،جن کی طرف سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔یہ اگرچہ خالص سیاسی جھگڑے ہیں لیکن ان کی اہمیت بھی مذہبی سوال سے کسی طرح کم نہیں۔جہاں مجھے حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اُسے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کا احساس ہے وہاں میں حکومت کو احتسابِ خویش کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں پُوچھنا چاہتا ہوں کہ شہری اور دیہاتی مسلمان کی تمیز کے لیئے کون ذمہ دار ہے؟جس کی بدولت مسلمان جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔اور دیہاتی حِصّہ خود بہُت سے گروہوں میں بٹ گیا ہے جو ہر دم آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں؟

سر ہربرٹ ایمرسن پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں۔اے کاش!وُہ سمجھ سکتے کہ حکومت کی اس شہری دیہاتی تمیز نے،جسے وُہ خود غرض سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعہ برقرار رکھتی ہے،جماعت کو ناقابل بنا دیا ہے کہ وُہ صحیح رہنما پیدا کر سکے میرے خیال میں اس حربہ کا استعمال ہی اس غرض سے کیا گیا ہے۔تاکہ کوئی صحیح رہنما پیدا نہ ہو سکے۔سر ہربرٹ ایمرسن صحیح رہنما کی عدم موجودگی کا رونا روتے ہیں اور میں اس نظام کا رونا روتا ہوں،جس نے ایسے رہنما کی پیدائش کو ناممکن بنا دیا ہے[1]۔

---

[1] حرفِ اقبال،صفحہ ۱۱۳-۱۱۹ مرتبہ لطیف احمد شروانی،ایم-اے

ضمیمہ °

مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے بیان سے بعض حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں اور یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ میں نے حکومت کو یہ دقیق مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی تحریک کا بہ جبر انسداد کردے۔ میرا یہ مدعا ہرگز نہ تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت کردی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کی موجودہ حکمران قوم اختیار کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں۔ البتہ مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے فوائد کے خلاف ہے۔ اگرچہ اس سے بچنے کی راہ کوئی نہیں۔ جنہیں خطرہ محسوس ہو، اُنہیں خود اپنی حفاظت کرنی پڑے گی۔

میری رائے میں حکومت کے لیئے بہترین طریقِ کار یہ ہوگا کہ وُہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرلے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا، جیسے وُہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔[1]

° جب حضرت علامہؒ کا بیان "قادیانی اور جمہور مسلمان" اخبارات میں شائع ہوا تو بعض لوگ اس سے یہ سمجھے کہ شاید حضرتِ علامہ نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی جماعت کو بہ جبر ختم کردے، اس پر علامہ مرحوم نے مذکورہ وضاحت فرمائی۔

[1] "حرفِ اقبال" ص ۱۱۹، مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے

'اسٹیٹسمین' کے جواب میں

میرے بیان مطبوعہ ۱۴ مئی پر آپ نے تنقیدی اداریہ لکھا' اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ جو سوال آپ نے اپنے مضمون میں اُٹھایا ہے' وُہ فی الواقعہ بہت اہم ہے اور مجھے مسرّت ہے کہ آپ نے اس سوال کی اہمیّت کو محسوس کیا ہے۔ میں نے اپنے بیان میں اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیشِ نظر جو انہوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوّت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے۔ خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اُٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں اور مجھے اس احساس میں حکومت کے سکھوں کے متعلق رویّہ سے اور بھی تقویت ملی۔ سکھ ۱۹۱۹ء تک آئینی طور پر علیحدہ سیاسی جماعت تصوّر نہیں کیے جاتے تھے۔ لیکن اس کے بعد علیحدہ جماعت تسلیم کر لیے گئے۔ حالانکہ اُنہوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں۔

اب چونکہ آپ نے یہ سوال پیدا کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس مسئلہ کے متعلق، جو برطانوی اور مسلم دونوں زاویۂ نگاہ سے نہایت اہم ہے، چند معروضات پیش کروں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں واضح کروں کہ حکومت جب کسی جماعت کے مذہبی اختلافات کو تسلیم کرتی ہے تو میں اسے کس حد تک گوارا کر سکتا ہوں۔ سو عرض ہے کہ:

○ اخبار 'اسٹیٹسمین' (دہلی) نے اپنی ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں حضرت علامہ کا بیان 'قادیانی اور جمہور مسلمان' شائع کیا اور ساتھ ہی اُس پر ایک تنقیدی اداریہ بھی لکھا۔ مذکورہ مضمون دراصل اسی اداریہ کا جواب ہے، جو ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کو اخبار مذکور میں طبع ہوا۔

اوّلاً اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے۔ جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ختمِ رسالت پر ایمان در اصل یہ آخری یقین ہی وُہ حقیقت ہے، جو مُسلم اور غیر مُسلم کے درمیان وجہِ امتیاز ہے کہ فرد یا گروہ ملّتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں؟ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں ۔ اور رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں۔ لیکن اُنہیں ملّتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قادیانیوں کی طرح وُہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ختمِ نبوّت کو نہیں مانتے[1]۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اِسلامی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختمِ نبوّت کے اصُول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وُہ الگ جماعت ہیں۔ اور مُسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیتِ دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملّت کے رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت کا مرہونِ منّت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور ختمِ نبوّت کے اصول کو صریحاً جھٹلا دیں یا پھر ختمِ نبوّت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پُورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ اُن کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ اُن کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ اُنہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔

ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویّہ کو

---

[1] قادیانی یہ استدلال کرتے ہیں کہ ہم تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خاتم الانبیاء مانتے ہیں، ہم منکر، اور دائرہ اسلام سے خارج، کیسے ہوئے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ جب کسی نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خاتم الانبیاء مان کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کسی اور نئے نبی کی نبوّت کو تسلیم کر لیا تو اس کا خاتم الانبیاء کا اقرار باطل ہو گیا۔ گویا دائرۂ اسلام سے نکلنے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار ضروری نہیں۔ کسی نئے نبی کا اقرار بھی آدمی کو اسلام کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے۔

فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ بانئ تحریک نے مِلّتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دُودھ سے تشبیہہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دُودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملّتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں اُن کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) مسلمانوں کی قیام نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مُسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کر دُنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وُہ اسلام سے اس سے کہیں دُور ہیں، جتنے سِکھ، ہندوؤں سے کیونکہ سِکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگرچہ وُہ ہندوؤں میں پُوجا نہیں کرتے۔

ثالثاً اس امر کو سمجھنے کے لیئے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیٰحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ پھر وُہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیئے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو ۵۶۰۰۰ (چھپن ہزار) ہے، اُنہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لیئے انہیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مِل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جُداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وُہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں اُن کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا علیحدہ لحاظ رکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ مِلّتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پُورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیٰحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ وُہ ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔

حکومت نے ۱۹۱۹ء میں سکھوں کی طرف سے علیٰحدگی کے مطالبہ کا انتظار نہ کیا، اب وُہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کے لیئے کیوں انتظار کر رہی ہے؟[1]

---

[1] حرفِ اقبال، ۱۲۷ تا ۱۲۹ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم اے

اِسلام اور احمدیّت°

"ماڈرن ریویو" کلکتہ، میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضامین شائع ہونے کے بعد مجھے اکثر مسلمانوں نے، جو مختلف مذہبی و سیاسی مسلک رکھتے ہیں، متعدد خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کی خواہش ہے کہ میں احمدیوں کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے طرزِ عمل کی مزید توضیح کروں۔ اور اس طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کروں۔ بعض یہ دریافت کرتے ہیں کہ میں احمدیت میں کس مسئلہ کو تنقیح طلب سمجھتا ہوں۔ اس بیان میں میں اُن مطالبات کو پُورا کرنا چاہتا ہوں، جن کو میں بالکل جائز تصور کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد ان سوالات کا جواب دینا چاہتا ہوں جو پنڈت جواہر لال نہرو نے اُٹھائے ہیں۔ بہر حال مجھے اندیشہ ہے کہ اس بیان کا ایک حصّہ پنڈت جی کے لیئے دلچسپ نہ ہوگا۔ لہٰذا ان کا وقت بچانے کے لیئے میرا یہ مشورہ ہے

° حضرتِ علامہؒ کے بیان "قادیانی اور جمہور مسلمان" کا شائع ہونا تھا کہ ایوانِ قادیانیت میں ایک زلزلہ برپا ہو گیا۔ گویا کسی نے بم پھینک دیا ہو۔ وُہ سب لوگ جو اپنے مفاد کی خاطر قادیانیوں سے ہمدردی رکھتے تھے لنگر لنگوٹ کس کر حضرتِ علامہؒ کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اسلامی تعلیمات سے نا واقفیت کے باوجود نہایت ناگوار لب و لہجہ میں "ماڈرن ریویو" کلکتہ میں تین مضمون گھسیٹ ڈالے (اُن کا مفاد کیا تھا؟ اور تب قادیانی جماعت نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر اُن کا پُرجوش استقبال کیوں کیا؟ یہ بات اپنی جگہ ہے) مگر حضرت علامہؒ کے لیئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ پنڈت جی کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیتے۔ انہوں نے اپنی شدید علالت کے باوجود مندرجہ بالا طویل بیان جاری کیا، جو (تخمیناً) ۱۹ جنوری ۱۹۳۶ء کو طبع ہوا، حالانکہ اُنہیں آرام کی ضرورت تھی اور اطبّا نے دماغی محنت سے احتراز کی ہدایت کی رکھی تھی (مکتوباتِ اقبال، صفحہ ۲۱۳،۲۱۲ مرتبہ سید نذیر نیازی) علامہ مرحوم کو اس بیان اور اس کی اشاعت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ احباب کو خط لکھ لکھ کر دریافت فرماتے رہے کہ اُن تک پہنچا یا نہیں؟ (ایضاً صفحہ ۲۱۷) یورپ تک اپنی آواز پہنچانے کے لیئے اپنے اس مضمون کا ایک الگ ایڈیشن شائع کیا۔ (ایضاً)

کہ وُہ ایسے حصّوں کو نظر انداز کر دیں۔

یہ بیان کرنا میرے لیئے ضروری نہیں کہ پنڈت جی کو مشرق کے، بلکہ ساری دُنیا کے ایک عظیم الشان مسئلے سے جو دلچسپی ہے، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میری رائے میں یہ پہلے ہندوستانی قوم پرست قائد ہیں، جنہوں نے دُنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے اس بے چینی کے مختلف پہلوؤں اور ممکن ردِّ عمل کے مدِ نظر ہندوستان کے ذی فکر سیاسی قائدین کو چاہیئے کہ اس وقت قلبِ اسلام میں جو چیز ہیجان پیدا کر رہی ہے، اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

بہرحال میں اس واقعہ کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں، میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ جن سوالات کو وُہ سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ تاہم جس طریقے سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اُس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لیئے دُشوار ہے۔ میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصُول کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اُس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنار پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے حقائق کو کچل ڈالا ہے۔ اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو۔ میری رائے میں ان کا یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستانی قومیت کے لیئے ملک کی مختلف تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیئے۔ حالانکہ ان تہذیبوں کے باہمی عمل و اثر سے ہندوستان ایک ترقی پذیر اور پائدار تہذیب کو نمو دے سکتا ہے۔ ان طریقوں سے جو تہذیب نمُو پائے گی اس کا نتیجہ بجز باہمی تشدد اور تلخی کے اور کیا ہو گا؟ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وُہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند

کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا کہ پیغمبرِ عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی اُمت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وُہ گزر رہے ہیں، اس میں ان کا اندرونی استحکام کس قدر ضروری ہے اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے، جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں، پنڈت جی کو یہ موقع دیتی ہے کہ ایسی تحریکوں سے ہمدردی کریں۔

بہرکیف میں پنڈت جی کے محرکات کی تحلیل کے ناگوار فرض کو جاری رکھنا نہیں چاہتا۔ جو لوگ قادیانیت کے متعلق عام مسلمانوں کے طرزِ عمل کی توضیح چاہتے ہیں، اُن کے استفادہ کے لئے میں ڈیورنٹ[1] کی کتاب "افسانۂ فلسفہ[2]" کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے قارئین کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ قادیانیت میں امرِ تنقیح طلب کیا ہے۔ ڈیورنٹ نے فلسفیِ اعظم اسپائنوزا[3] کے جماعت بدر کئے جانے سے متعلق یہودی نقطۂ نظر کو اختصار کے ساتھ چند جملوں میں بیان کیا ہے۔ قارئین یہ خیال نہ کریں کہ اس اقتباس کے پیش کرنے سے میرا مطلب اسپائنوزا اور بانیِ احمدیت میں کسی قسم کا موازنہ کرنا ہے۔ عقل و سیرت کے لحاظ سے ان دونوں کے مابین بُعدِ عظیم ہے۔ "خدامست" اسپائنوزا نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وُہ کسی جدید تنظیم کا مرکز ہے اور جو یہودی اس پر ایمان نہ لائے یہودیت سے خارج ہے۔ اسپائنوزا کے جماعت بدر کئے جانے کے متعلق ڈیورنٹ کی عبارت یہودیوں کے طرزِ عمل پر اس قدر منطبق نہیں ہوتی جس قدر کہ قادیانیت کے متعلق مسلمانوں کے طرزِ عمل پر ہوتی ہے۔ یہ عبارت حسبِ ذیل ہے:

> "علاوہ بریں اکابرِ یہود کا خیال تھا کہ امسٹرڈم[4] میں اُن کی جو چھوٹی سی جماعت تھی اُن کو انتشار سے بچانے کا واحد ذریعہ مذہبی وحدت ہے اور یہودیوں کی جماعت کو جو دُنیا میں بکھری ہوئی ہے، برقرار رکھنے اور ان میں اتفاق پیدا کرنے

---

[1] Derant
[2] 'Story of Philosophy'
[3] Spinoza
[4] Amsterdam

کا آخری ذریعہ بھی یہی ہے۔ اگر ان کی اپنی کوئی سلطنت، کوئی ملکی قانون اور دُنیاوی
قوّت وطاقت کے ادارے ہوتے جن کے ذریعہ وُہ اندرونی استحکام اور بیرونی استحکام
حاصل کر سکتے تو وُہ زیادہ روادار ہوتے۔ لیکن ان کا مذہب اُن کے لیئے ایمان
بھی تھا اور حبّ الوطنی بھی۔ ان کا معبد ان کی عبادت کا اور مذہبی رسوم کے علاوہ اُن
کی سماجی اور سیاسی زندگی کا بھی مرکز تھا۔ ان حالات کے ماتحت اُنہوں نے الحاد کو غدّاری اور
رواداری کو خودکشی تصوّر کیا۔"

امسٹرڈم میں یہودیوں کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی۔ اس لحاظ سے وُہ اسپائنوزا کو ایسی
انتشار انگیز ہستی سمجھنے میں حق بجانب تھے جس سے ان کی جماعت بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ اس
طرح مسلمانانِ ہند یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ تحریکِ قادیانیت جو تمام دُنیائے اسلام
کو کافر قرار دیتی ہے اور اس سے معاشرتی مقاطعہ کرتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی حیاتِ ملّی کے
لیئے اسپائنوزا کی اس مابعد الطبیعات سے زیادہ خطرناک ہے جو یہود کی حیاتِ ملّی
کے لیئے تھی۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانانِ ہند ان حالات کی مخصوص نوعیت کو جبلّی طور پر محسوس
کرتے ہیں جن میں کہ وُہ ہندوستان میں گھرے ہوئے ہیں۔ اور دُوسرے ممالک کے مقابلہ میں انتشار
انگیز قوتوں کا قدرتی طور پر زیادہ احساس رکھتے ہیں۔ ایک اوسط مسلمان کا یہ جبلّی ادراک میری رائے
میں بالکل صحیح ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس احساس کی بنیاد مسلمانانِ ہند کے ضمیر کی گہرائیوں
میں ہے۔ اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وُہ لفظ رواداری
کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ وُہ لوگ اس لفظ کو بالکل
نہیں سمجھتے۔ گبن[1] کہتا ہے کہ "ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام
مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری مؤرّخ کی ہے جس کے نزدیک تمام
مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبّر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب
یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں
کو روا رکھتا ہے، کیونکہ وُہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری

---

[1] Gibbon

کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص پر کی جاتی ہے برداشت کر لیتا ہے، یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قسم کی رواداری اخلاقی قدر سے معرا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس سے اُس شخص کے رُوحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے، جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ حقیقی رواداری عقلی اور رُوحانی وُسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو رُوحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے، دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے اور اُن کی قدر کر سکتا ہے۔ ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خود اس کا مذہب ائتلافی ہے، اس وجہ سے وُہ بآسانی دوسرے مذاہب سے ہمدردی رکھ سکتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے شاعرِ اعظم امیر خسرو نے ایک بُت پرست کے قصّہ میں اس قسم کی رواداری کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اُس کی بتوں سے بے اندازہ محبت کے تذکرہ کے بعد شاعر اپنے مُسلمان قارئین کو یُوں مخاطب کرتا ہے ؎

اے کہ زبُت طعنہ بہ ہندی بُری
ہم زوے آموز پرستش گری°

خدا کا ایک سچا پرستار ہی عبادت و پرستش کی قدر و قیمت کو محسوس کر سکتا ہے، خواہ اس پرستش کا تعلق ایسے ارباب سے ہو جن پر وہ اعتقاد نہیں رکھتا۔ رواداری کی تلقین کرنے والے اُس شخص پر عدمِ رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرزِ عمل کو وُہ غلطی سے اخلاقی کمتری خیال کرتے ہیں۔ وُہ نہیں سمجھتے کہ (اس) طرزِ عمل میں حیاتیاتی قدر و قیمت مضمر ہے۔ جب کسی جماعت کے افراد جبلّی طور یا کسی عقلی دلیل کی بنا پر یہ محسوس کرتے ہوں کہ اُس جماعت کی اجتماعی زندگی خطرہ میں ہے۔ جس کے یہ رُکن ہیں تو اُن کے مدافعانہ طرزِ عمل کو

° اے ہندیوں کی بُت پرستی پر طعن کرنے والے تو اِن سے پرستش کا طریقہ سیکھ۔

حیاتیاتی معیار پر جانچنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ہر فکر و عمل کی تحقیق اس لحاظ سے کرنی چاہیئے کہ اس میں حیات افروزی کس قدر ہے؟ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ ایسے شخص کے متعلق جو ملحد قرار دیا گیا ہو، کسی فرد یا جماعت کا رویہ اخلاقاً صائب ہے یا غیر صائب؟ سوال یہ ہے کہ یہ حیات افروز ہے یا حیات کُش؟ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ جو جماعت مذہبی اصولوں پر قائم ہوتی ہے وہ محکمۂ احتساب[1] کے قیام کو مُستلزم ہے۔ تاریخِ مسیحیت کے متعلق یہ بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن تاریخِ اسلام پنڈت جی کی منطق کے خلاف یہ ثابت کرتی ہے کہ حیاتِ اسلامی کے گذشتہ تیرہ سو سال میں اسلامی ممالک محکمۂ احتساب سے بالکل ناآشنا رہے ہیں۔ قرآن واضح طور پر ایسے ادارے کی ممانعت کرتا ہے "دوسروں کی کمزوریوں کی تلاش نہ کرو اور بھائیوں کی چغلی نہ کھاؤ"[2] پنڈت جی کو تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوجائے گا کہ یہودی اور عیسائی اپنے وطن کے مذہبی تشدد سے تنگ آکر اسلامی ممالک میں پناہ لیتے تھے۔ جن دو قضایا پر اسلام کی تعقّلی عمارت قائم ہے، وہ اس قدر سادہ ہیں کہ ان میں ایسا الحاد ناممکن ہے۔ جس سے ملحد دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب کوئی شخص ایسے ملحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظامِ اجتماعی خطرہ میں پڑ جاتا ہو تو ایک آزادانہ اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کرے گی۔ لیکن ایسی صورت میں ریاست کا فعل سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوگا، نہ کہ خالص مذہبی اصولوں پر۔ میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں کہ پنڈت جی ایسا شخص، جس کی پیدائش اور تربیت ایک ایسی جماعت میں ہوئی ہو جس کی سرحدیں متعیّن نہیں ہیں اور جس میں اندرونی استحکام بھی مفقود ہے، اس امر کا بمشکل اندازہ کرسکتا ہے کہ ایک مذہبی جماعت ایسے محکمۂ احتساب کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے، جو حکومت کی جانب سے عوام کے عقائد کی تحقیقات کے لیئے قائم کیا جاتا ہے۔ یہ

---

[1] قرونِ وسطیٰ میں Inquisition کے نام سے ایک محکمہ قائم ہوا تھا، جو لوگوں کے عقائد مذہبی کی تحقیق و تفتیش کرتا تھا۔ برونو وغیرہ ایسے علمار سائنس کو اس محکمہ نے نذرِ آتش کیا۔ (حرفِ اقبال)

[2] وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ۔ (سُورۃ الحُجرات، آیت: ۱۲)

بات کارڈنل نیومن[1] کی اُس عبارت سے بالکل واضح ہو جاتی ہے، جو پنڈت جی پیش کر کے حیرت کرتے ہیں کہ میں کارڈنل کے اصولوں کو کس حد تک اسلام پر قابلِ اطلاق سمجھتا ہوں؟ میں اُن سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی اندرونی ہیئتِ ترکیبی اور کیتھولک مسیحیت میں اختلافِ عظیم ہے۔ کیتھولک مسیحیت کی پیچیدگی اس کی فوق العقلی نوعیت اور تحکّمی عقائد کی کثرت نے، جیسا کہ تاریخِ مسیحیت سے ظاہر ہوتا ہے، مُلحدانہ تاویلات کے لیئے راستہ کھول دیا ہے۔ اسلام کا سیدھا سادھا مذہب دو قضایا پر مبنی ہے۔ خُدا ایک ہے اور محمّدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس سلسلۂ انبیاء کے آخری نبی ہیں جو وقتاً فوقتاً ہر ملک اور ہر زمانے میں اس غرض سے مبعوث ہوتے رہے کہ نوعِ انسان کی رہنمائی صحیح طرزِ زندگی کی طرف کریں۔ جیسا کہ بعض عیسائی مصنفین خیال کرتے ہیں کہ کسی تحکّمی عقیدے کی تعریف اسی طرح کی جانی چاہیئے کہ وُہ ایک فوق العقل قضیہ ہے۔ اور اس کو مذہبی استحکام کی خاطر اور اس کا مابعد الطبیعی مفہوم سمجھے بغیر مان لینا چاہیئے تو اس لحاظ سے اسلام کے ان دو سادہ قضایا کو تحکّمی عقیدے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کی تائید نوعِ انسان کے تجربہ سے ہوتی ہے۔ اور ان کی عقلی توجیہ بخوبی کی جا سکتی ہے۔ ایسے الحاد کا سوال جہاں یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اُس کا مُرتکب دائرۂ مذہب میں ہے یا اُس سے خارج ہے؟ ایسی مذہبی جماعت میں، جو ایسے سادہ قضایا پر مبنی ہو، اُس صورت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ مُلحد ان قضایا میں سے کسی ایک یا دونوں سے انکار کر دے۔ تاریخِ اسلام میں ایسا واقعہ شاذ ہی وقوع پذیر ہوا ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیئے کیونکہ جب اس قِسم کی کوئی بغاوت پیدا ہوتی ہے تو ایک اوسط مُسلمان کا احساس قُدرتی طور پر شدید ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ایران کا احساس بہائیوں کے خلاف اس قدر تھا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف اس قدر شدید ہے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقے فقہ اور دینیات کے فروعی مسائل میں اختلاف

---

[1] Cardinal Newman

کی وجہ سے اکثر و بیشتر، ایک دُوسرے میں الحاد کا الزام لگاتے رہے ہیں: دینیات کے فرُوعی مسائل کے اختلاف میں اور نیز الحاد کی ایسی انتہائی صورتوں میں جہاں مُلحد کو جماعت سے خارج کیا جاتا ہے۔ لفظِ کُفر کے غیر مُحتاط استعمال کو آج کل کے تعلیم یافتہ مُسلمان، جو مسلمانوں کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں، مِلت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرُوعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعثِ انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

پروفیسر ہرگرانیج[1] کہتے ہیں کہ جب ہم فقہ اسلامی کے نشوونما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہر زمانے کے علماء خفیف سے اشتعال کے باعث ایک دُوسرے کی مذمت یہاں تک کرتے ہیں کہ ایک دُوسرے پر کُفر کا الزام عائد ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ اتحادِ عمل کے ساتھ اپنے پیشروؤں کے اختلاف رفع کرتے ہیں؛ اسلامی دینیات کا متعلّم جانتا ہے کہ مُسلم فقُہا اس قسم کے الحاد کو اصطلاحی زبان میں کُفر زیرِ کُفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایسا کُفر جس میں مُرتکب جماعت سے خارج نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مُلاؤں کے ذریعے جن کا عقلی تعطل دینیاتی تفکر کے ہر اختلاف کو قطعی سمجھتا ہے اور اختلاف میں اتحاد کو دیکھ نہیں سکتا۔ خفیف سا الحاد فتنۂ عظیم کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس فتنۂ کا انسداد اس طرح ہو سکتا ہے کہ مدارسِ دینیات کے طلباء کے سامنے اسلام کی اِتلافی روح کا واضح ترین تصور پیش کریں۔ اور ان کو یہ بتلائیں کہ منطقی تضاد کے دینیاتی تفکر میں اصولِ حرکت کا کام کرتا ہے۔ یہ سوال کہ الحادِ کبیرہ کس کو کہتے ہیں؟ اُس وقت پیدا ہوتا ہے، جبکہ کسی مفکّر یا مُصلح کی تعلیم مذہب اسلام کی سرحدوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے قادیانیت کی تعلیم میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ تحریکِ احمدیت دو جماعتوں میں مُنقسم ہے، جو قادیانی اور

---

[1] Hurgroung

لاہوری جماعتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اوّل الذکر جماعت بانیٔ احمدیت کو نبی تسلیم کرتی ہے آخر الذکر نے اعتقاداً یا مصلحتاً قادیانیت کی شدت کو کم کر کے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ بہرحال یہ سوال کہ آیا بانیٔ احمدیت ایک نبی تھا اور اس کی تعلیم سے انکار کرنا "الحادِ کبیرہ" کو مستلزم ہے؟ ان دونوں جماعتوں میں متنازعہ فیہ ہے۔ احمدیوں کے ان گھریلو مناقشات کے محاسن کو جانچنا میرے پیش نظر مقصد کے لیے غیر ضروری ہے۔ میرا یقین ہے، جس کے وجوہ میں آگے چل کر بیان کروں گا، کہ ایسے نبی کا تصور جس کے انکار کرنے سے منکر خارج (از) اسلام ہو جاتا ہے، احمدیت کا ایک لازمی عنصر ہے اور لاہوری جماعت کے امام کے مقابلہ میں قادیانیوں کے موجودہ پیشوا تحریک احمدیت کی روح سے بالکل قریب ہیں۔

ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے[1]۔ اس کے معنیٰ بالکل سلیس ہیں۔ محمد۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد جنہوں نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیرِ انسان کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے، آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ محمد ___ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ تمام عالمِ اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانیٔ احمدیت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبرِ اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کہ پیغمبرِ اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی۔ خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے۔ لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب اوّل جزو ۱، ۲ اور ۳

کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ ـــ محمدؐ ـــ (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری نبی نہیں، میں آخری نبی ہوں"۔ اس امر کے سمجھنے کی بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوعِ انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر رکھتا ہے، بانیٔ احمدیت کا خیال ہے کہ ختمِ نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ ـــ محمدؐ ـــ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا، خود ـــ محمدؐ ـــ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے۔ جب میں بانیٔ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ اُن کے دعویٔ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وُہ اپنے دعوٰی کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوّت کو صرف ایک نبی یعنی تحریکِ احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مُورِث کی ختمِ نبوت پر مُتصرّف ہو جاتا ہے۔

اس کا دعوٰی ہے کہ میں پیغمبرِ اسلام کا 'بُروز' ہوں۔ اس سے وُہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ کہ پیغمبرِ اسلام کا بروز ہونے کی حیثیت سے اس کا خاتم النبیین ہونا دراصل ـــ محمدؐ ـــ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتم النبیین ہونا ہے۔ پس یہ نقطۂ نظر پیغمبرِ اسلام کی ختمِ نبوت کو مسترد نہیں کرتا۔ اپنی ختمِ نبوت کو پیغمبرِ اسلام کی ختمِ نبوت کے مُماثل قرار دے کر بانیٔ احمدیت نے ختمِ نبوت کے تصور کے زمانی مفہوم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بہرحال یہ ایک بدیہی بات ہے کہ بُروز کا لفظ مکمل مشابہت کے مفہوم میں بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔ کیونکہ بُروز ہمیشہ اُس شئے سے الگ ہوتا ہے جس کا یہ بُروز ہوتا ہے۔ صرف اَوتار کے معنوں میں بُروز اور اس شئے میں عینیت پائی جاتی ہے۔ پس اگر ہم بُروز سے 'روحانی صفات کی مشابہت' مراد لیں تو یہ دلیل بے اثر رہتی ہے۔ اگر اس کے برعکس اس لفظ کے آریائی مفہوم میں اصل شئے کا اوتار مراد لیں تو یہ دلیل بظاہر قابلِ قبول ہوتی ہے۔ لیکن اس خیال کا مُوجد مجوسی بھیس میں نظر آتا ہے۔

ہسپانیہ کے برگزیدہ صوفی محی الدین ابن العربی کی سند پر یہ مزید دعوٰی کیا جاتا ہے، کہ ایک مُسلمان وَلی کے لیئے اپنے روحانی ارتقار کے دوران میں اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے جو شعورِ نبوت سے مُختص ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی کا یہ خیال نفسیاتی نقطۂ نظر سے دُرست نہیں۔ لیکن اگر اس کو صحیح فرض کر لیا جائے تو تب بھی قادیانی

استدلال شیخ کے موقف کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ ایسے تجربہ کو ذاتی کمال تصور کرتے ہیں۔ جس کی بنا پر کوئی ولی یہ اعلان نہیں کر سکتا کہ جو شخص اُس پر (یعنی ولی پر) اعتقاد نہیں رکھتا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زمانہ اور ملک میں ایک سے زیادہ اولیاء موجود ہو سکتے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک ولی کا شعورِ نبوت تک پہنچنا اگرچہ ممکن ہے، تاہم اس کا تجربہ اجتماعی اور سیاسی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اس کو کسی نئی تنظیم کا مرکز بناتا ہے اور یہ استحقاق عطا کرتا ہے کہ وُہ اس نئی تنظیم کو پیروانِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایمان یا کُفر کا معیار قرار دے۔

اس صُوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کر کے 'فتوحات' کی متعلقہ عبارتوں کو پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہسپانیہ کا یہ عظیمُ الشان صوفی ــــ محمّد ــــ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ختمِ نبوت پر اُسی طرح مستحکم ایمان رکھتا ہے، جس طرح کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے۔ اگر شیخ کو اپنے صوفیانہ کشف میں یہ نظر آجاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنہیں تصوف کا شوق ہے، شیخ کی صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں پیغمبرِ اسلام کی ختمِ نبوت سے اِنکار کر دیں گے تو یقیناً عُلماءِ ہند سے پہلے مُسلمانانِ عالَم کو ایسے غدارانِ اسلام سے متنبّہ کر دیتے۔

اب احمدیت کی رُوح پر غور کرنا ہے۔ اس کے مآخذ اور اس امر کی بحث کہ قبل اسلام مجوسی تصورات نے اسلامی تصوّف کے ذریعہ بانیٔ احمدیت کے ذہن کو کس طرح متاثر کیا؟ مذہبِ مُتقابلہ کی نظر سے بیحد دلچسپ ہو گی۔ لیکن میرے لیے اس بحث کو اُٹھانا ممکن نہیں۔ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ احمدیت کی اصل حقیقت قرونِ وسطیٰ کے تصوّف اور دینیات کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ علماءِ ہند نے اس کو محض ایک دینیاتی تحریک تصوّر کیا اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ طریقہ موزوں نہیں تھا۔ اس وجہ سے عُلماء کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بانیٔ احمدیت کے الہامات کی اگر دقیق النظری سے تحلیل کی جائے تو یہ ایک ایسا مؤثر طریقہ ہو گا جس کے ذریعہ سے ہم اس کی شخصیت اور اندرونی زندگی کا تجزیہ کر سکیں گے۔ اس سلسلہ میں مَیں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مولوی منظورِ الٰہی نے بانیٔ احمدیت کے الہامات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اُس میں نفسیاتی تحقیق کے لیے متنوع اور

مختلف مواد موجود ہے ۔ میری رائے میں یہ کتاب بانیٔ احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی کُنجی ہے ۔ اور مجھے اُمید ہے کہ کسی دن نفسیاتِ جدید کا کوئی متعلم اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا ۔ اگر وُہ قرآن کو اپنا معیار قرار دے (اور چند وُجوہ سے اس کو ایسا کرنا ہی پڑے گا ۔ جن کی تشریح یہاں نہیں کی جا سکتی) اور اپنے مطالعہ کو بانیٔ احمدیت اور اس کے ہم عصر غیر مسلم صُوفیا جیسے رام کرشنا بنگالی کے تجربوں تک پھیلائے تو اُس کو اس تجربہ کی اصل ماہیّت کے متعلق بڑی حیرت ہوگی ۔ جس کی بنا پر بانیٔ احمدیت نبوت کا دعویدار ہے ۔

عام آدمی کے نقطۂ نظر سے ایک اور مؤثر اور مفید طریقہ یہ ہے کہ ۱۷۹۹ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے، اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مظروف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے ۔ دُنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء بے حد اہم ہے ۔ اُس سال ٹیپو کو شکست ہوئی ۔ اس کی شکست کے ساتھ مسلمانوں کو ہندوستان میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کی جو اُمید تھی اس کا بھی خاتمہ ہوگیا ۔ اسی سال جنگِ نوارینو، وقوع پذیر ہوئی ، جس میں ترکی کا بیڑہ تباہ ہوگیا۔[1] جو لوگ سرنگاپٹم گئے ہیں ، اُن کو ٹیپو کے مقبرے پر یہ تاریخِ وفات کندہ نظر آئی ہوگی :

"ہندوستان اور روم کی عظمت ختم ہوگئی ۔"

ان الفاظ کے مصنّف نے پیش گوئی کی تھی ، پس ۱۷۹۹ء میں ایشیا میں اسلام کا انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تھا ۔ لیکن جس طرح ژینا میں جرمنی کی شکست کے بعد جدید جرمن قوم کا نشوونما ہوا ، کہا جا سکتا ہے کہ اسی طرح ۱۷۹۹ء میں اسلام کی سیاسی شکست کے بعد جدید اسلام اور اس کے مسائل معرضِ ظہور میں آئے ۔ اس امر پر میں آگے چل کر بحث کروں گا ۔ فی الحال میں قارئین کی توجہ چند مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں ، جو ٹیپو کی شکست اور ایشیا میں مغربی شہنشاہیت کی آمد کے

---

[1] "جنگِ نوارینو" ۱۷۹۹ء میں نہیں ، ۱۸۲۷ء میں وقوع پذیر ہوئی تھی ۔ حضرت علامہؒ نے سید نذیر نیازی کے نام اپنے ایک خط میں اس کی تصحیح بھی فرما دی تھی ۔ اور سید صاحب موصوف کو ہدایت کی تھی کہ وُہ اُن کے مضمون "Islam and Ahmadism" کا اُردو ترجمہ کرتے ہوئے اس غلطی کو دُرست کریں ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مکتوباتِ اقبال ص ۳۲۲

بعد اسلامی ہند میں پیدا ہو گئے ہیں۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ مسلمانانِ ہند اور وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں، ترکی خلافت سے کیا تعلق رکھتے ہیں؟ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی آیت "خدا، رسول اور تم میں سے اُولی الامر کی اطاعت کرو"[1] میں الفاظ "تم میں سے" کا کیا مفہوم ہے؟ احادیث سے آمدِ مہدی کی جو پیشین گوئی کی جاتی ہے، اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور اسی قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداہتہً صرف مسلمانانِ ہند سے تھا۔ اس کے علاوہ مغربی شہنشاہیت کو بھی جو اُس وقت اسلامی دُنیا میں سُرعت کے ساتھ تسلط حاصل کر رہی تھی ان سوالات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وُہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر۔ مسلمان اربابِ سیاست جن کی آنکھیں واقعات پر جمی ہوئی تھیں علمار کے ایک طبقہ کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وُہ دینیاتی استدلال کا ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جو صورتِ حال کے مناسب ہو۔ لیکن محض منطق سے ایسے عقائد پر فتح پانا آسان نہ تھا جو صدیوں سے مسلمانانِ ہند کے قلوب پر حکمران تھے۔ ایسے حالات میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بنار پر آگے بڑھ سکتی ہے یا قرآن و حدیث کی نئی تفسیر کے ذریعہ۔ ہر دو صورتوں میں استدلال عوام کو متاثر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وُہ ربانی سند ہے۔ راسخ عقائد کو مؤثر طریقہ پر مٹانے اور متذکرہ صدر سوالات میں جو دینیاتی نظریات مضمر ہیں، اُن کی نئی تفسیر کرنے کے لیے جو سیاسی اعتبار سے موزوں ہو، ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی۔ اس الہامی بنیاد کو احمدیت نے فراہم کیا۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے، جو انہوں نے انجام دی ہے۔ پیغمبرانہ الہام کو ایسے دینیاتی خیالات کی بنیاد قرار دینا جو سیاسی اہمیت رکھتے ہیں گویا اس

---

[1] اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (سورۃ النسار۔ آیت: ۵۹)

بات کا اعلان کرنا ہے کہ جو لوگ مدعیٔ نبوت کے خیالات کو قبول نہیں کرتے اوّل درجہ کے کافر ہیں اور ان کا ٹھکانہ نارِ جہنّم ہے۔ جہاں تک میں نے اس تحریک کے منشا کو سمجھا ہے، احمدیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح (علیہ السلام) کی موت ایک عام فانی انسان کی موت تھی اور رجعتِ مسیح (علیہ السلام) گویا ایسے شخص کی آمد ہے جو رُوحانی حیثیت سے اس کا مُشابہ ہے۔ اس خیال سے اس تحریک پر ایک طرح کا عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے لیکن یہ ابتدائی مَدارج ہیں۔ اُس تصوّرِ نبوت کو جو ایسی تحریک کے اغراض کو پورا کرتا ہے جن کو جدید سیاسی قوتیں وجود میں لائی ہیں۔ ایسے ممالک میں جو ابھی تمدّن کی ابتدائی منازل میں ہیں منطق سے زیادہ سَند کا اثر ہوتا ہے۔ اگر کافی جہالت اور زُودِ اعتقادی موجود ہو اور کوئی شخص اس قدر بے باک ہو کر حاملِ الہام ہونے کا دعویٰ کرے، جس سے اِنکار کرنے والا ہمیشہ کے لیئے گرفتارِ لعنت ہو جاتا ہے تو ایک محکوم اسلامی ملک میں ایک سیاسی دینیات کو وجود میں لانا اور ایک ایسی جماعت کو تشکیل دینا آسان ہو جاتا ہے، جس کا مسلک سیاسی محکومیت ہو۔ پنجاب میں مُبہَم دینیاتی عقائد کا فرسودہ جال اس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخر کر لیتا ہے، جو صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو مشورہ دیتے ہیں کہ تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ متحد ہو جائیں اور اس چیز کی مزاحمت کریں، جس کو وُہ ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طنز آمیز مشورہ اس بات کو فرض کر لیتا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وُہ نہیں جانتے کہ جہاں تک ہندوستان میں اسلام کا تعلق ہے، احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں۔ جیسا کہ میں نے اُوپر تشریح کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکّر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ خالص مذہبی امور سے قطع نظر سیاسی امور کی بنا پر بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے شایانِ شان نہیں کہ وُہ مسلمانانِ ہند پر رَجعت پسند اور قدامت پسند ہونے کا الزام لگائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وُہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو مسلمانانِ ہند کے اُس رویّہ کی ضرور تعریف و تحسین کرتے جو ایک ایسی مذہبی تحریک کے متعلق اختیار کیا گیا ہے جو ہندوستان کے تمام آفات و مصائب کے لیے الہامی سند پیش کرتی ہے۔

پس قارئین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسلام کے رُخساروں پر اس وقت احمدیت کی جو زردی نظر آرہی ہے، وُہ مسلمانانِ ہند کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں کوئی ناگہانی واقعہ نہیں ہے۔ وُہ خیالات جو بالآخر اس تحریک میں رُونما ہوئے ہیں، بانیٔ احمدیت کی ولادت سے پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں رہ چکے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بانیٔ احمدیت اور اس کے رُفقا نے سوچ سمجھ کر اپنا پروگرام تیار کیا ہے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ بانیٔ احمدیت نے ایک آواز سُنی لیکن اس امر کا تصفیہ کہ یہ آواز اُس خدا کی طرف سے تھی جس کے ہاتھ میں زندگی اور طاقت ہے۔ یا لوگوں کے رُوحانی افلاس سے پیدا ہوئی، اس تحریک کی نوعیت پر منحصر ہونا چاہیئے جو اس آواز کی آفریدہ ہے اور اُن افکار و جذبات پر بھی جو اس آواز نے اپنے سننے والوں میں پیدا کئے ہیں۔ قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں استعارات استعمال کر رہا ہوں۔ اقوام کی تاریخ حیات بتلاتی ہے کہ جب کسی قوم کی زندگی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے اور اس قوم کے شعراء، فلاسفہ، اولیاء، مُدبّرین اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور مبلّغین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آجاتی ہے، جس کا مقصدِ واحد یہ ہوتا ہے کہ منطق کی سحر آفرین قوتوں سے اس قوم کی زندگی کے ہر اُس پہلو کی تعریف و تحسین کرے جو نہایت ذلیل و قبیح ہوتا ہے۔ یہ مبلّغین غیر شعوری طور پر مایوسی کو اُمید کے درخشاں لباس میں چُھپا دیتے ہیں، کردار کے روایتی اقتدار کی بیخ کُنی کرتے ہیں اور اس طرح اُن لوگوں کی رُوحانی قوت کو مٹا دیتے ہیں جو اُن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اُن لوگوں کی قوتِ ارادی پر ذرا غور کرو جنہیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وُہ تمام ایکٹر جنہوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصّہ لیا ہے، زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹ پُتلی بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی اسی قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن اُس میں نہ وُہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لیئے ہندوستان میں پیدا کئے ہیں۔ رُوس نے بابی مذہب کو روا رکھا اور بابیوں کو اجازت دی کہ وُہ اپنا پہلا تبلیغی مرکز عشق آباد میں قائم کریں۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز

دوکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے لیئے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بنا پر کیا یا وُسعتِ نظر کی وجہ سے۔ اس قدر تو بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لیئے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اسلام کی اُس ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے، مجھے یقینِ کامل ہے کہ اسلام اُن دُشواریوں سے جو اُس کے لیئے پیدا کی گئی ہیں زیادہ پاک و صاف ہو کر نکلے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان کے حالات ایک نیا رُخ اختیار کر چکے ہیں۔ جمہوریت کی نئی رُوح جو ہندوستان میں پھیل رہی ہے، وُہ یقیناً احمدیوں کی آنکھیں کھول دے گی۔ اُنہیں یقین ہو جائے گا کہ اُن کی دینیاتی ایجادات بالکل بے سُود ہیں۔

اسلام قرُونِ وُسطیٰ کے اُس تصوّف کی تجدید کو بھی روا نہ رکھے گا جس نے اپنے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو کچل کر ایک مُبہم تفکّر کی طرف اُن کا رُخ موڑ دیا۔ اس تصوّف نے گزشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے اور سلطنت کو معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ جدید اسلام اس تجربہ کو دُہرا نہیں سکتا اور نہ وُہ پنجاب کے اس تجربے کے اعادے کو روا رکھ سکتا ہے۔ جس نے مسلمانوں کو نصف صدی تک ایسے دینیاتی مسائل میں اُلجھائے رکھا جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام جدید تفکّر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے۔ اور کوئی ولی یا پیغمبر اس کو قرُونِ وسطیٰ کے تصوّف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا۔

اب میں پنڈت جواہر لال کے سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ پنڈت جی کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام یا انیسویں صدی کے اسلام کی مذہبی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ انہوں نے شاید میری تحریرات کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے؟ جن میں اُن کے سوالات پر بحث کی گئی ہے۔ میرے لیئے یہاں اُن تمام خیالات کا اعادہ کرنا ممکن نہیں جن کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ انیسویں صدی کے مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کو پیش کرنا بھی یہاں ممکن نہیں۔ جس کے بغیر دُنیائے اسلام کی موجودہ صورتِ حال کو پُوری طرح سمجھنا دشوار ہے۔ ترکی اور جدید اِسلام کے متعلق سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں، میں اس لٹریچر کے بیشتر حصہ کا مطالعہ کر چکا ہوں اور غالباً پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس کا مطالعہ کر چکے

ہوں گے۔ بہر حال میں اُنہیں یقین دلاتا ہوں کہ اُن میں سے ایک مصنّف نے بھی اُن نتائج یا اُن اسباب کی اصل ماہیت کو نہیں سمجھا جو ان نتائج کا باعث ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے تفکّر کے خصوصی رُجحانات کو جو انیسویں صدی کے ایشیا میں پائے جاتے ہیں اجمالی طور پر بیان کر دینا ضروری ہے:

میں نے اُوپر بیان کیا ہے کہ ۱۷۹۹ء میں اسلام کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ بہر حال اسلام کی اندرونی قوّت کا اس واقعہ سے بڑھ کر کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ اس نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ دُنیا میں اس کا کیا موقف ہے؟ انیسویں صدی میں سر سیّد احمد خاں ہندوستان میں، سیّد جمال الدین افغانی افغانستان میں اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ یہ حضرات غالباً محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوئے تھے۔ جن کی ولادت ۱۷۰۰ء میں بمقام نجد ہوئی تھی۔ اور جو اُس نام نہاد وہابی تحریک کے بانی تھے جس کو صحیح طور پر جدید اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سر سیّد احمد خاں کا اثر بحیثیت مجموعی ہندوستان ہی تک محدود رہا۔ غالباً یہ عصرِ جدید کے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تھی۔ اور یہ محسوس کیا تھا کہ ایجابی عُلوم اس دور کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے نیز روس میں مفتی عالم جان نے، مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا۔ مگر سر سیّد احمد خاں کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ ہم اُن کے مذہبی خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حسّاس رُوح نے سب سے پہلے عصرِ جدید کے خلاف ردّ عمل کیا۔

مسلمانانِ ہند کی انتہائی قدامت پرستی جو زندگی کے حقائق سے دُور ہو گئی تھی سر سیّد احمد خاں کے مذہبی نقطۂ نظر کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھ سکی۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں جو ابھی تہذیب کی ابتدائی منزل میں ہے اور جہاں دیگر اقطاعِ ہند کے مقابلہ میں پیر پرستی زیادہ مسلط ہے، سر سیّد کی تحریک کے خلاف احمدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک میں سامی اور آریائی تصوّف کی عجیب و غریب آمیزش تھی اور اس میں کسی فرد کا رُوحانی احیاء قدیم اسلامی تصوّف کے اصولوں کے مطابق نہیں

ہو سکتا تھا۔ بلکہ مسیح موعود کی آمد کو پیش کر کے عوام کی کیفیت کو تشفی انتظار دی جاتی تھی۔ اس مسیح موعود کا فرض یہ نہیں تھا کہ فرد کو موجودہ پستی سے نجات دلائے بلکہ اس کا کام یہ تعلیم دینا ہے کہ لوگ اپنی رُوح کو غلامانہ طور پر پستی اور انحطاط کے سپرد کر دیں۔ اس ردِّ عمل ہی کے اندر ایک نازک تضاد مضمر ہے۔ یہ تحریک اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اُس قوتِ ارادی کو فنا کر دیتی ہے، جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

مولانا سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔ جمال الدین افغانی دُنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ اُن کی بے چین رُوح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران، مصر، اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہٗ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائدین گئے۔ جیسے مصر کے زاغلول پاشا وغیرہ اُنہیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ اُنہوں نے لکھا کم اور کہا بہت۔ اور اس طریقہ سے ان تمام لوگوں کو جنہیں اُن کا قُرب حاصل ہوا، چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انہوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے رُوحِ اسلام میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی جس قدر کہ انہوں نے کی تھی۔ اُن کی رُوح اب بھی دُنیائے اسلام میں سرگرمِ عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوگی؛

بہرحال اب یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان جلیل القدر ہستیوں کی غایت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے دُنیائے اسلام میں تین مخصوص قوتوں کو حکمران پایا اور ان قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کے لیئے اپنی پُوری طاقت کو مرتکز کر دیا۔

۱۔ مُلّائیت، علماء ہمیشہ اسلام کے لیئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں۔ لیکن صدیوں کے مُرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانے سے وُہ بے حد قدامت پرست بن گئے، اور آزادیٔ اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مُصلحینِ اسلام کے لیئے حوصلہ افزا تھی، درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے

اس جمود کے خلاف، پس انیسویں صدی کے مصلحینِ اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

۲۔ تصوّف، مسلمانوں پر ایک ایسا تصوّف مسلط تھا، جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہّم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوّف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وُہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زُود اعتقادی سے فائدہ اُٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اسی نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر زم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مُصلحین نے اس قسم کے تصوّف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مُصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی اُس رُوح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گُریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

۳۔ مُلوکیّت، مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لیئے وُہ اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سیّد جمال الدین افغانی کا مقصدِ خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دُنیائے اسلام کے اُن حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے فکر و تاثر کی دُنیا میں اِن مُصلحین نے جو انقلاب پیدا کیا ہے، اس کا تفصیلی بیان یہاں ممکن نہیں۔ بہرحال ایک چیز بہُت واضح ہے۔ ان مُصلحین نے زاغلول پاشا، مصطفیٰ کمال اور رضا شاہ ایسی ہستیوں کی آمد کے لیے راستہ طیار کر دیا۔ ان مُصلحین نے تعبیر و تفسیر، توجیہہ و توضیح کی، لیکن جو افراد ان کے بعد آئے اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے تاہم اپنے صحیح رُجحانات پر اعتماد کر کے جُرأت کے ساتھ میدانِ عمل میں کُود پڑے اور زندگی کی نئی ضروریات کا جو تقاضا تھا اس کو جبر و قوت سے پُورا کیا۔ ایسے لوگوں سے غلطیاں بھی ہوا کرتی ہیں لیکن تاریخِ اقوام بتلاتی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہیں۔ ان کے اندر منطق نہیں بلکہ زندگی ہیجان برپا کر دیتی ہے اور اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیئے مُضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ سر سیّد احمد خان، سیّد جمال الدین افغانی اور اُن کے سینکڑوں شاگرد جو اسلامی ممالک میں تھے،

مغرب زدہ مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ یہ وُہ لوگ تھے جنہوں نے قدیم مکتب کے ملاؤں کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا اور اُس عقلی و رُوحانی فضا میں سانس لیا تھا۔ جس کو وُہ از سرِ نو تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ جدید خیالات کا اثر ضرور پڑا ہے۔ لیکن جس تاریخ کا اجمالی طور پر اُوپر ذکر کیا گیا ہے اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں جو انقلاب ظہور پذیر ہوا اور جو جلد یا بدیر دوسرے اسلامی ممالک (میں) بھی ظہور پذیر ہونے والا ہے، بالکل اندرونی قوتوں کا آفریدہ تھا۔ جدید دُنیائے اسلام کو جو شخص سطحی نظر سے دیکھتا ہے وہی شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ دُنیائے اسلام کا موجودہ انقلاب محض بیرونی قوتوں کا رہینِ منت ہے۔

کیا ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک خاص کر ترکی نے اسلام کو ترک کر دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ ترکی اب اسلامی ملک نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتے کہ یہ سوال کہ آیا کوئی شخص یا جماعت اسلام سے خارج ہو گئی، مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ایک خالص فقہی سوال ہے اور اس کا فیصلہ اسلام کی ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے کرنا پڑے گا۔ جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتا ہے یعنی توحید اور ختمِ نبوت، تو اُس کو ایک راسخ العقیدہ مُلا بھی اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں کر سکتا۔ خواہ فقہ اور آیاتِ قرآنی کی تاویلات میں وُہ کتنی ہی غلطیاں کرے۔ غالباً پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن میں وُہ مفرُوضہ یا حقیقی اصلاحات ہیں، جو اتاترک نے رائج کی ہیں۔ اب ہم تھوڑی دیر کے لئے ان کا جائزہ لیں گے۔ کیا ترکی میں ایک عام مادّی نقطۂ نظر کا نشوونما اسلام کے منافی ہے؟ مسلمانوں میں ترکِ دُنیا کا بہُت رواج رہ چکا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اب وقت آ گیا ہے کہ وُہ حقائق کی طرف متوجہ ہوں۔ مادیّت، مذہب کے خلاف کے ایک بڑا حربہ ہے۔ لیکن مُلّا اور صُوفی کے پیشوں کے استیصال کے لیے ایک مؤثر حربہ ہے جو عمداً لوگوں کو اس غرض سے گرفتارِ حیرت کر دیتے ہیں کہ اُن کی جہالت اور زُود اعتقادی سے فائدہ اُٹھائیں۔ اسلام کی رُوح مادّہ کے قُرب سے نہیں ڈرتی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمہارا دین میں جو حصّہ ہے اس کو نہ بھولو۔ ایک غیر مُسلم کے لیے اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں دُنیائے اسلام کی جو تاریخ رہی ہے، اس کے لحاظ سے مادّی نقطۂ نظر کی ترقی مستحق ذات کی ایک صُورت ہے۔ کیا لباس کی تبدیلی یا لاطینی رسم الخط کا رواج

اسلام کے منافی ہے؟ اسلام کا بحیثیت ایک مذہب کے کوئی وطن نہیں اور بحیثیت ایک معاشرت کے اس کی نہ کوئی مخصوص زبان ہے اور نہ کوئی مخصوص لباس۔ قرآن کا ترکی زبان میں پڑھا جانا تاریخِ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی چند مثالیں موجود ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس کو فکر و نظر کی ایک سنگین غلطی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ عربی زبان و ادب کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقبل ہے، تو وُہ عربی ہے۔ بہر حال اب یہ اطلاعیں آ رہی ہیں کہ ترکوں نے مُلکی زبان میں قرآن پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ تو کیا کثرتِ ازدواج کی ممانعت یا علماء پر لائسنس حاصل کرنے کی قید منافیٔ اسلام ہے؟ فقہ اسلام کی رُو سے ایک اسلامی ریاست کا امیر مُجاز ہے کہ شرعی 'اجازتوں' کو منسوخ کر دے[1]۔ بشرطیکہ اس کو یقین ہو جائے کہ یہ 'اجازتیں' معاشرتی فساد پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں۔ رہا علماء کا لائسنس حاصل کرنا، آج مجھے اختیار ہوتا تو یقیناً میں اسے اسلامی ہند میں نافذ کر دیتا۔ ایک اوسط مسلمان کی سادہ لوحی زیادہ تر افسانہ تراش مُلّا کی ایجادات کا نتیجہ ہے۔ قوم کی مذہبی زندگی سے ملاؤں کو الگ کر کے اتاترک نے وُہ کام کیا جس سے ابنِ تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دِل مسرت سے لبریز ہو جاتا۔ رسولِ کریم (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی ایک حدیث مشکوٰۃ میں درج ہے جس کی رُو سے وعظ کرنے کا حق صرف اسلامی ریاست کے امیر یا اس کے مقرر کردہ شخص یا اشخاص کو حاصل ہے۔ خبر نہیں اتاترک اس حدیث سے واقف ہیں یا نہیں؛ تاہم یہ

---

[1] یہاں حضرتِ علامہؒ کو سہو ہو گیا ہے۔ اجازت تنسیخ کی نہیں، التوا کی ہے اس کا اندازہ سیّد سلیمان ندویؒ کے نام اُن کے ایک خط سے بھی ہوتا ہے۔ جس میں حضرتِ علامہؒ سیّد موصوف کو اُن کے ایک خط کی عبارت یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں: "ایک خط میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اُسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو منسوخ کر دے عارضی طور پر یا مستقل طور پر، بلکہ بعض فرائض کو بھی منسوخ کر سکتا ہے اس وقت آپ کا خط میرے سامنے نہیں ہے، حافظے سے لکھ رہا ہوں، کیا یہ بات صحیح ہے؟" ——— اسی خط کے حاشیہ میں سیّد سلیمان ندویؒ کے یہ الفاظ درج ہیں: "ڈاکٹر صاحب کے حافظہ نے غلطی کی ہے۔ ملتوی کی جگہ منسوخ لکھ گئے ہیں"، ملاحظہ ہو "مکاتیبِ اقبال" ج ۱ ص ۱۸۲ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم۔ اے

ایک حیرت انگیز بات ہے کہ اس کے اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم ترین معاملہ میں اس کے میدانِ عمل کو کس طرح منوّر کر دیا ہے۔ سوئز قانون[1] اور اس کے قواعدِ وراثت کو اختیار کر لینا ضرور ایک سنگین غلطی ہے، جو جوشِ اصلاح کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے اور ایک ایسی قوم میں جو سُرعت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتی ہے ایک حد تک قابلِ معافی ہے۔ پیشوایانِ مذہب کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کی مسرت ایک قوم کو بعض اوقات ایسی راہِ عمل کی طرف کھینچ لے جاتی ہے، جس کا اس قوم کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ ترکی اور نیز تمام دُنیائے اسلام کو اسلامی قانونِ وراثت کے ان معاشی پہلوؤں کو ابھی منکشف کرنا ہے جن کو وان کریمر[2] "فقہِ اسلام کی بے حد اونچی شاخ" سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا تنسیخِ خلافت یا مذہب وسلطنت کی علیحدگی منافیٔ اسلام ہے؟ اسلام اپنی روح کے لحاظ سے شہنشاہیت نہیں ہے۔ اس خلافت کی تنسیخ جو بنو اُمیّہ کے زمانے سے عملاً ایک سلطنت بن گئی تھی، اسلام کی رُوح اتاترک کے ذریعہ کار فرما رہی ہے۔ مسئلۂ خلافت میں تُرکوں کے اجتہاد کو سمجھنے کے لیے ہمیں ابنِ خلدون کی رہنمائی حاصل کرنا پڑے گی، جو اسلام کا ایک جلیل القدر فلسفی، مورّخ اور تاریخِ جدید کا ابوالآبا گزرا ہے۔ میں اپنی کتاب "اسلامی تفکر کی تشکیلِ جدید[3]" کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

ابنِ خلدون اپنے مشہور "مقدمۂ تاریخ" میں عالمگیر اسلامی خلافت سے متعلق تین ممتاز نقاطِ نظر پیش کرتا ہے۔ (۱) عالمگیر خلافت ایک مذہبی ادارہ ہے، اسی لیے اس کا قیام ناگزیر ہے۔ (۲) اس کا تعلق محض اقتضائے وقت سے ہے۔ (۳) ایسے ادارے کی ضرورت ہی نہیں۔ آخر الذکر خیال کو خارجیوں نے اختیار کیا تھا جو اسلام کے ابتدائی جمہورین تھے۔ ترکی پہلے خیال کے مقابلہ میں دوسرے خیال کی طرف مائل ہے۔ یعنی معتزلہ کے اُس خیال کی طرف کہ عالمگیر خلافت محض اقتضائے وقت سے تعلق رکھتی ہے۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہم کو اپنے سیاسی

---

[1] مراد ہے سوئٹزرلینڈ کا ضابطۂ قانون۔

[2] Von Kremer

[3] مُراد ہے

تفکّر میں اپنے ماضی کے سیاسی تجربے سے مدد لینی چاہیئے جو بلا شک و شبہ اس واقعہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ عالمگیر خلافت کا تفکر و تخیّل عملی صورت اختیار کرنے سے قاصر رہا۔ یہ تخیّل اس وقت قابلِ عمل تھا جب کہ اِسلامی ریاست برقرار تھی۔ اس ریاست کے انتشار کے بعد کئی آزاد سلطنتیں وجود میں آگئی ہیں۔ اب یہ تخیل بے اثر ہوگیا ہے اور اسلام کی تنظیمِ جدید میں ایک زندگی بخش عُنصر کی حیثیت سے کارگر نہیں ہو سکتا۔

مذہب و سلطنت کی علیٰحدگی کا تصور بھی اسلام کے لیے غیر مانُوس نہیں ہے۔ امام کی غَیبتِ کُبریٰ[1] کا نظریہ ایک مفہوم میں ایک عرصہ پہلے شیعی ایران میں اس علیٰحدگی کو رُو بہ عمل لا چکا ہے ریاست کے مذہبی و سیاسی وظائف کی تقسیم کے اسلامی تصور کو کلیسا اور سلطنت کے مغربی تصور سے مخلوط نہ کرنا چاہیئے۔ اوّل الذکر تو محض وظائف کی ایک قسم ہے جیسا کہ اسلامی ریاست میں شَیخُ الاسلام اور وُزراء کے عہدوں کے تدریجی قیام سے واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن آخر الذکر رُوح اور مادّہ کی مابعد الطّبعی ثنویّت پر مبنی ہے۔ مسیحیت کا آغاز ایک نظامِ رُہبانیت سے ہوتا ہے جسے دنیوی اُمور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسلام ابتداء ہی سے ایک نظامِ معاشری رہا ہے، جس کے قوانین بالطبع معاشری ہیں۔ اگرچہ ان کا ماخذ الہامی ہے۔ مابعد الطّبعی ثنویّت نے جس پر مذہب و سلطنت کی علیٰحدگی کا مغربی تصور مبنی ہے مغربی اقوام میں تلخ ثمرات پیدا کیے۔ کئی سال ہوئے امریکہ میں ایک کتاب لکھی گئی تھی جس کا عنوان تھا "اگر مسیح شکاگو آئیں"[2]، اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف کہتا ہے :

"مسٹر سٹیڈ[3] کی کتاب سے ہمیں جو سبق حاصل کرنا ہے یہ ہے کہ اس وقت نوعِ انسان جن برائیوں میں مُبتلا ہے وُہ ایسی بُرائیاں ہیں جن کا ازالہ

---

[1] یہ اشارہ ہے اُس عقیدے کی طرف کہ امام مہدیؑ امام آخرالزماں ہیں۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت ہوئی کہ وہ سامرا کے ایک غار میں رُوپوش ہو گئے۔ وُہ زندہ ہیں گو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں" مکتوباتِ اقبالؒ، ص۱۷۱ مرتبہ سید نذیر نیازی)

[2] 'If Christ Came to Chicago'

[3] Mr. Stead,

صرف مذہبی تاثرات ہی کر سکتے ہیں۔ ان برائیوں کا ازالہ ایک بڑی حد تک
ریاست کے سپرد کر دیا گیا تھا لیکن خود ریاست فساد انگیز سیاسی مشینوں میں دب
گئی ہے۔ یہ مشینیں ان برائیوں کا ازالہ کرنے کے لیئے نہ صرف تیار نہیں بلکہ وُہ
اس قابل نہیں ہے۔ پس کروڑہا انسانوں کو تباہی اور خود ریاست کو انحطاط سے
بچانے کے لیئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ شہریوں میں اپنے اجتماعی فرائض
کا مذہبی احساس پیدا کیا جائے"

مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب و سلطنت کی علیٰحدگی محض وظائف کی علیٰحدگی ہے
نہ کہ عقائد کی۔ اسلامی ممالک میں مذہب و سلطنت کی علیٰحدگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں
کی قانون سازی عوام کے ضمیر سے بے تعلق ہو جائے۔ جو صدیوں سے اسلامی روحانیت کے تحت
پرورش و نمو پاتا رہا ہے۔ تجربہ خود بتلا دے گا کہ یہ تخیل جدید ترکی میں کس طرح عملی صورت اختیار
کرتا ہے۔ ہم صرف یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ ان بُرائیوں کا باعث نہ ہو گا جو یورپ اور امریکہ
میں پیدا ہو گئی ہیں۔

متذکرۃُ الصّدر اصلاحات پر میں نے جو اجمالی بحث کی ہے اس میں میرا رُوئے سخن پنڈت
جواہر لال نہرو سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھا۔ پنڈت نہرو نے جس اصلاح کا خاص طور پر ذکر
کیا ہے وُہ یہ ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی نصب العین اختیار کر لیا ہے۔ معلوم
ہوتا ہے کہ وُہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا نصب العین اختیار کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ترکوں اور
ایرانیوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ تاریخ کا متعلّم اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا جب
کہ وحدتِ انسانی کے قدیم اصول جیسے خونی رشتہ اور ملوکیت ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ پس اسلام نے وحدتِ
انسانی کا اصول گوشت اور پوست میں نہیں بلکہ رُوحِ انسانی میں دریافت کیا۔ نوعِ انسان کو اسلام کا اجتماعی پیغام
یہ ہے کہ "نسل کے قیود سے آزاد ہو جاؤ یا باہمی لڑائیوں سے ہلاک ہو جاؤ"۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں
کہ اسلام فطرت کی نسل سازی کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے مخصوص اداروں کے ذریعہ
ایسا نقطۂ نظر پیدا کر دیتا ہے جو فطرت کی نسل ساز قوتوں کی مزاحمت کرتا ہے۔ انسانی برادری قائم
کرنے کے سلسلہ میں اسلام نے جو اہم ترین کارنامے ایک ہزار سال میں انجام دیئے وُہ مسیحیت اور

بُدھ مت نے ڈھائی ہزار سال میں بھی انجام نہیں دیئے۔ یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہندی مُسلمان نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود مراکش پہنچ کر اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام نسل کا بہرے سے مخالف ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشرتی اصلاح کو زیادہ تر اس امر پر مبنی رکھا کہ بتدریج نسلی عصبیت کو مٹایا جائے اور ایسا راستہ اختیار کیا جائے جہاں تصادم کا کم سے کم امکان ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے "ہم نے تم کو قبائل میں اس لیئے پیدا کیا کہ تم پہچانے جا سکو لیکن تم میں سے وہی شخص خدا کی نظر میں بہترین ہے جس کی زندگی پاک ہے[1]۔" اگر اس امر کو مدِنظر رکھا جائے کہ مسئلہ نسل کس قدر زبردست ہے اور نوعِ انسان سے نسلی امتیازات مٹانے کے لیے کس قدر وقت درکار ہے؛ تو مسئلہ نسل کے متعلق صرف اسلام ہی کا نقطۂ نظر (یعنی خود ایک نسل ساز عُنصر بنے بغیر نسلی امتیازات پر فتح پانا) معقول اور قابلِ عمل نظر آئے گا۔ سر آرتھر کیتھ[2] کی چھوٹی سی کتاب "مسئلہ نسل" میں ایک دلچسپ عبارت ہے جس کا اقتباس یہاں پیش کرنا نامناسب نہ ہو گا۔

"اب انسان میں اس قسم کا شعور پیدا ہو رہا ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد یعنی نسل سازی جدید معاشی دُنیا کی ضروریات کے منافی ہے اور وُہ اپنے دل سے پُوچھتا ہے کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیا نسل سازی کو ختم کر کے جس پر فطرت اب تک عمل پیرا تھی دائمی امن حاصل کیا جائے یا فطرت کو اجازت دی جائے کہ وُہ اپنی قدیم راہِ عمل اختیار کرے۔ جس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے؟ انسان کو کوئی ایک راہِ عمل اختیار کرنا پڑے گی۔ کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں۔"

لہٰذا اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر اتاترک اتحادِ تُورانیت سے متاثر ہے تو وُہ روحِ اسلام کے خلاف اس قدر نہیں جا رہا جس قدر کہ روحِ عصر کے خلاف۔ اگر وُہ نسلوں کے

---

[1] يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ط (سورۃ "الحجرات" آیت: ۱۳)

[2] Sir Arther Keith

وجود کو ضروری سمجھتا ہے تو اس کو عصرِ جدید کی رُوح شکست دے دے گی۔ کیونکہ عصرِ جدید کی رُوح بالکل رُوحِ اسلام کے مطابق ہے۔ بہرحال ذاتی طور پر میں خیال کرتا ہوں کہ اتاترک اتحادِ تورانیت سے متاثر نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس کا اتحادِ تورانیت ایک سیاسی جواب ہے اتحادِ اسلامی یا اتحادِ المانیوتیت یا اتحادِ اینگلوسیکسن کا۔

اگر مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو قومی نصب العین سے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں دُشواری نہ ہوگی۔ اگر قومیت کے معنیٰ حب الوطنی اور ناموسِ وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اُس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وُہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعوٰی کرتی ہے۔ اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عُنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں قومیت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے اور یہاں کی اقلیتیں جیسے یہودی، عیسائی اور زرتشتی اسلامی قانون کی رُو سے یا تو اہلِ کتاب ہیں یا اہلِ کتاب سے مشابہ ہیں، جن سے معاشی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے بالکل جائز ہے۔ قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے صرف اُن ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں وُہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہو کہ وُہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے، کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ جن ممالک میں مُسلمان اقلیت میں ہیں (وہاں) ـــــ مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی۔ دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہیں۔

سطورِ بالا میں دُنیائے اسلام کی صحیح صورتِ حال کو اجمالی طور پر پیش کر دیا گیا ہے، اگر اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ وحدتِ اسلامی کے بنیادی اصولوں کو کوئی بیرونی یا اندرونی قوت متزلزل نہیں کر سکتی۔ وحدتِ اسلامی، جیسا کہ میں نے پہلے توضیح کی ہے، مشتمل ہے اسلام کے دو بنیادی عقائد پر۔ جن میں پانچ مشہور ارکانِ شریعت کا اضافہ کر لینا چاہیے

وحدتِ اسلامی کے یہ اساسی عناصر ہیں جو رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے سے اب تک قائم ہیں۔ گو حال میں بہائیوں نے ایران اور قادیانیوں نے ہندوستان میں ان عناصر میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وحدت دُنیائے اسلام میں یکساں روحانی فضا پیدا کرنے کی ضامن ہے، یہی وحدت اسلامی ریاستوں میں سیاسی اتحاد قائم کرنے میں سہولت پیدا کرتی ہے خواہ یہ اتحاد عالمگیر ریاست (مثالی) کی صُورت اختیار کرے یا اسلامی ریاستوں کی جمعیت کی ایک صُورت یا متعدد آزاد ریاستوں کی صورت جن کے معاہدات اور میثاقات خالص معاشی و سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوں گے۔ اس طرح اس سیدھے سادے مذہب کی تعقلی ہیئتِ ترکیبی رفتارِ زمانہ سے ایک تعلق رکھتی ہے۔ اس تعلق کی گہرائی قرآن کی چند آیتوں کی روشنی میں سمجھ میں آسکتی ہے۔ جن کی تشریح پیشِ نظر مقصد سے ہٹے بغیر یہاں ممکن نہیں۔ سیاسی نقطۂ نظر سے وحدتِ اسلامی صرف اس وقت متزلزل ہوجاتی ہے جب کہ اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس وقت متزلزل ہوجاتی ہے جب کہ مسلمان بنیادی عقائد یا ارکانِ شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔ اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جاسکتی ہے۔ میرے خیال میں اس وقت اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے وہ سیاسی وحدت کی ایک صورت سے کسی دُوسری صورت کی طرف جو ابھی متعین نہیں ہوئی ہے اقدام کر رہا ہے۔ دُنیائے جدید میں حالات اس سُرعت کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ مستقبل کے متعلق پیشین گوئی تقریباً ناممکن ہے۔ اگر دُنیائے اسلام سیاسی وحدت حاصل کرے (اگر ایسا ممکن ہوا) تو غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف تاریخ ہی دے سکتی ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جغرافی حیثیت سے یُورپ اور ایشیا کے درمیان واقع ہونے کے لحاظ سے اور زندگی کے مشرقی و مغربی نصب العین کے ایک امتزاج کی حیثیت سے اسلام کو مشرق و مغرب کے مابین ایک طرح کا نقطۂ اتصال بننا چاہیئے۔ لیکن اگر یورپ کی نادانیاں اسلام کو ناقابلِ مفاہمت بنادیں تو کیا ہوگا؟ یورپ کے روزمرہ کے حالات جو

صُورت اختیار کر رہے ہیں ان کا اقتضا یہ ہے کہ یورپ اپنے طرزِ عمل کو کلیتہً بدل دے جو اس نے اسلام کے متعلق اختیار کیا ہے۔ ہم صرف یہ توقع کر سکتے ہیں کہ سیاسی بصیرت پر معاشی لُوٹ اور شہنشاہی ہوس کا پردہ نہیں پڑے گا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں یقینِ کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وُہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے۔

ہز ہائینس آغا خاں کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خاں پر کیوں حملے کئے؟ شاید وُہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زُمرے میں شامل ہیں وُہ اس بات سے بداہتہً بے خبر ہیں۔ کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں پھر بھی وُہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسلِ امامت کے قائل ہیں لیکن اُن کے نزدیک امام حاملِ وحی نہیں ہوتا ہے۔ وُہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ ہز ہائینس آغا خاں نے اپنے پیروؤں کو حسبِ ذیل الفاظ سے مخاطب کیا تھا۔ (دیکھو 'اسٹار' الہ آباد، ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء)

'گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، قرآن اللہ کی کتاب ہے، کعبہ سب کا قبلہ ہے، تم مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرو، مسلمانوں سے السلام علیکم کہہ کر ملو، اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو، مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھو، پابندی سے روزے رکھو۔ اسلامی قانونِ نکاح کے مطابق اپنی شادیاں کرو۔ تمام مسلمانوں سے اپنے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو۔'

اب پنڈت جواہر لال نہرو کو اس امر کا تصفیہ کرنا چاہیئے کہ آیا آغا خاں اسلامی وحدت کی نمائندگی کر رہے ہیں (مرتب) یا نہیں[1]؟

---

[1] حرفِ اقبال، ص ۱۲۹ تا ۱۶۱ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے

"کشمیر کمیٹی" کی صدارت سے استعفاء○

"کشمیر کمیٹی" میں میری صدارت محض عارضی تھی۔ یاد رہے کہ کمیٹی کی تشکیل کشمیر میں غیر متوقع واقعات کے اچانک رُونما ہونے پر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیئے ہوئی تھی۔ اور اس وقت یہ خیال تھا کہ اس قسم کی کمیٹی کی ضرورت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اس لیے کمیٹی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا تھا اور صدر[1] کو آمرانہ اختیارات دے دیئے گئے تھے۔

یہ خیال کہ کشمیر کمیٹی کی ایک مستقل ادارہ کی حیثیت سے ضرورت نہ ہو گی۔ ریاست میں پیدا ہونے والے واقعات نے غلط ثابت کر دیا۔ بہت سے ممبران نے اس لیئے یہ سوچا کہ کمیٹی کا ایک باقاعدہ نظام ہونا چاہیئے اور عہدیداروں کا نیا انتخاب ہونا چاہیئے۔ کمیٹی کے ارکان اور اس کے طریقِ کار کے متعلق کچھ لوگوں کے اختلاف نے جس کے اسباب کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہ ہو گا اس خیال کی مزید تائید کی۔ چنانچہ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں کمیٹی کے صدر[1] نے اپنا استعفاء پیش کیا اور وُہ منظور ہو گیا۔

پچھلے ہفتہ کے آخری دنوں میں کمیٹی کا ایک اور جلسہ ہوا اس میں ممبران کے سامنے نظام کا مسوّدہ پیش کیا گیا، جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ کمیٹی کی حیثیت ایک نمائندہ جماعت کی سی ہو لیکن کچھ ممبران نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ بعد کے بحث و مباحثہ اور گفتگو سے مجھے یہ پتہ لگا کہ یہ لوگ دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں اتحاد صرف برائے نام ہی ہو گا۔ چنانچہ میں نے اپنا استعفاء پیش کرنے سے پہلے ممبران کو اپنی اس رائے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا

○ یہ بیان ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کے اخبارات میں شائع ہوا، تب حضرتِ علامہؒ کشمیر کمیٹی کے عارضی صدر تھے۔ ("حرفِ اقبالؒ"، ص ۲۱ مرتبہ لطیف احمد شروانی)

[1] میرزا بشیر الدین محمود خلیفہ ثانی، میرزا غلام احمد قادیانی

بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دُوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلاء میں سے ایک صاحب نے، جو میرپور کے مقدمات کی پیروی کر رہے ہیں، حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے صاف طور پر کہا کہ وُہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انہوں نے یا اُن کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وہ اُن کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اُن کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا۔ اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہوگیا۔

میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اُسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔

جہاں تک مجھے علم ہے کشمیر کمیٹی کی عام پالیسی کے متعلق ممبران میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ پالیسی سے اختلاف کی بنا پر کسی نئی پارٹی کی تشکیل پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ لیکن جہاں تک میں نے حالات کا جائزہ لیا ہے کشمیر کمیٹی کے چند ارکان کو جو اختلافات ہیں وُہ بالکل بے تکے ہیں۔

ان حالات کے پیشِ نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانانِ کشمیر کی رہنمائی اور مدد کے لیئے برطانوی ہند میں ایک کشمیر کمیٹی ضرور ہونی چاہیئے۔ اس لیئے اگر برطانوی ہند کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وُہ مُجاز ہیں کہ ایک کھُلے عام اجلاس میں ایک نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کرلیں۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر مجھے صرف یہی ایک راستہ دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اپنے ان احساسات کو آپ کے سامنے کھُلے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ جنہوں نے مجھے استعفار دینے پر مجبور کیا مجھے اُمید ہے کہ میری یہ صاف گوئی کسی شخص

کوناگوار نہ گزرے گی۔ کیونکہ میرا مقصد نہ کسی کی بُرائی کرنا ہے اور نہ کسی پر اُنگلی اُٹھانا[۱]۔

---

[۱] حرفِ اقبال، ص ۲۰۲ تا ۲۰۴، مرتبہ لطیف احمد شروانی

تحریکِ کشمیر کی صدارت کی پیشکش کا استرداد

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا صدر ہوتے ہوئے میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ میں کمیٹی کے ممبران کو اس پر رائے زنی کا موقعہ دیئے بغیر اس خط کا جواب دے دوں جس میں مجھے صدارت پیش کی گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو بھی اس امر سے مطلع کر دیا تھا۔ میرے خط سے اخبارات کے بعض اہلِ قلم اصحاب نے جو اغلباً قادیانی ہیں یہ غلط مطلب اخذ کیا ہے کہ اصولی طور پر مجھے پیش کردہ صدارت کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لہٰذا میں بلد از جلد یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصولی اختلاف نہیں بلکہ میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں۔ اور میرے اس رویّہ کی وجوہات وہی ہیں جن کی بناء پر میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی نئی تشکیل ہونی چاہیئے۔

یہ پیشکش جو مجھے کی گئی ہے یقیناً ایک فریب ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو اس امر کے متعلق یقین دلانا ہے کہ سابقہ کشمیر کمیٹی حقیقت میں ختم نہیں ہوئی بلکہ نئی کمیٹی کے پہلو بہ پہلو ایک جماعت کی حیثیت سے موجود ہے اور یہ کہ وہ لوگ جنہیں نئی کمیٹی سے نکال دیا گیا ہے، وہ اب اس شخص کی رہنمائی میں کام کرنے کے لیئے طیار ہیں جو کمیٹی کی نئی تشکیل کا سب سے بڑا محرک تھا۔ لیکن اُن کی یہ چال کہ وہ اسباب جن کی بناء پر میں نے کشمیر کمیٹی کی از سرِ نو تشکیل کرائی اب ختم ہو گئے ہیں نہ تو مجھے قائل کر سکتی ہے اور نہ مُسلم عوام کو۔

قادیانی ہیڈ کوارٹرز سے ابھی اس مقصد کا کوئی واضح بیان شائع نہیں ہوا کہ قادیانیوں کے کسی مسلم ادارہ میں شریک ہونے کی صورت میں اُن کی اطاعت دو طرفہ نہ ہوگی۔ بلکہ واقعات سے تو یہ امر بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ ادارہ جس کو قادیانی اخبارات تحریکِ کشمیر کے نام سے موسوم

---

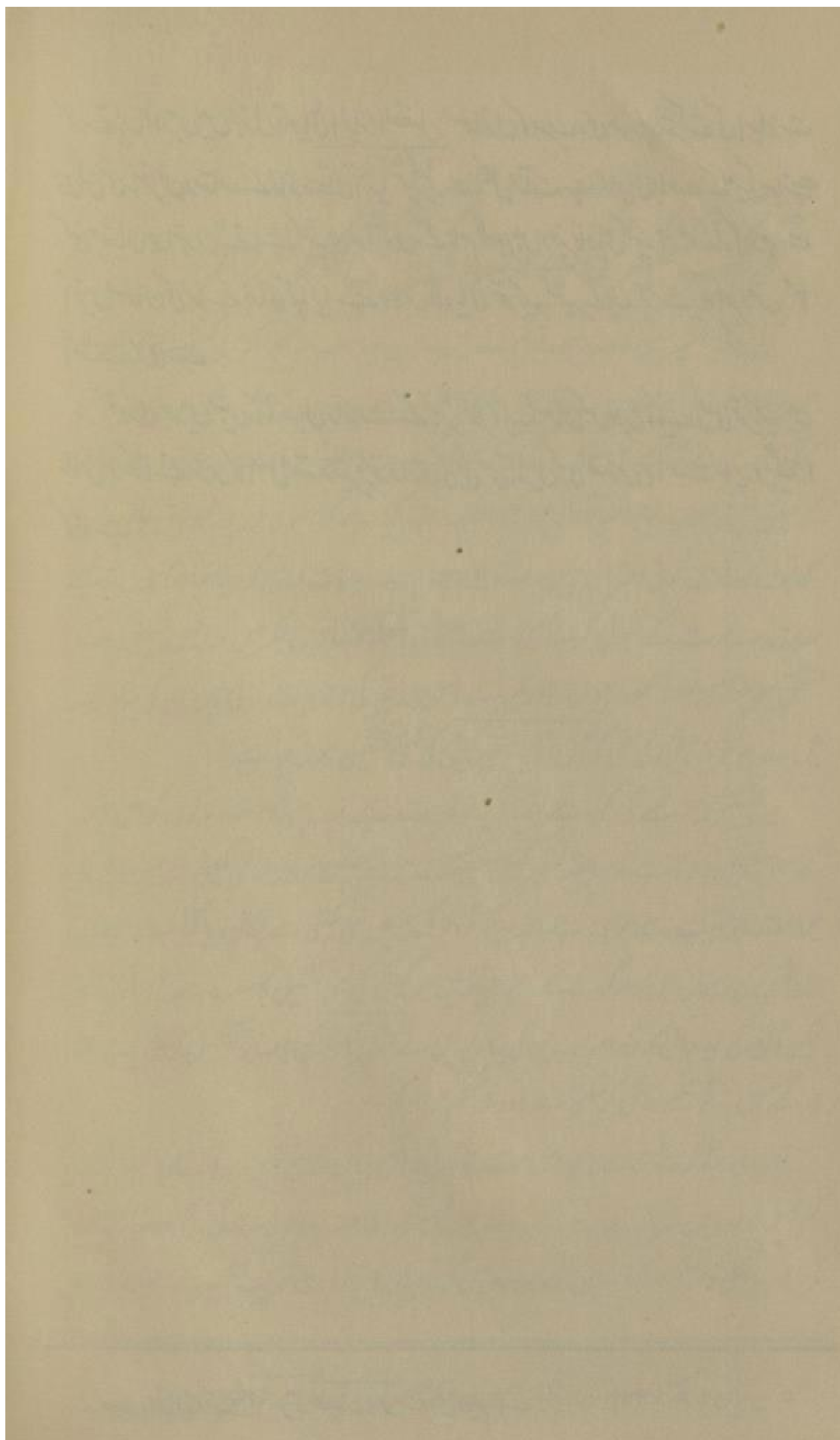
o یہ بیان ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو دیا گیا۔ (حرفِ اقبال، ص۲۰۱ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے)

کرتے ہیں اور جس میں بقول قادیانی اخبار "الفضل" مسلمانوں کو صرف رسمی طور پر شرکت کی اجازت دی گئی تھی، اغراض و مقاصد کے لحاظ سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے بالکل مختلف ہے۔ قادیانی جماعت کے امیر کی جانب سے کئی چٹھیاں جو انہوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کے نام لکھی ہیں (غیر قادیانی کشمیری ہونے کی وجہ سے اُنہیں مسلمان کی بجائے بھائی کہا گیا ہے) اس قادیانی تحریکِ کشمیر کے چند پوشیدہ اَغراض کا اِنکشاف کرتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اِن حالات کے پیشِ نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے، جس کا اصل مقصد غیر فرقہ داری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈا کرنا ہے[1]۔

---

[1] "حرفِ اقبال"، ص ۲۰۳ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے



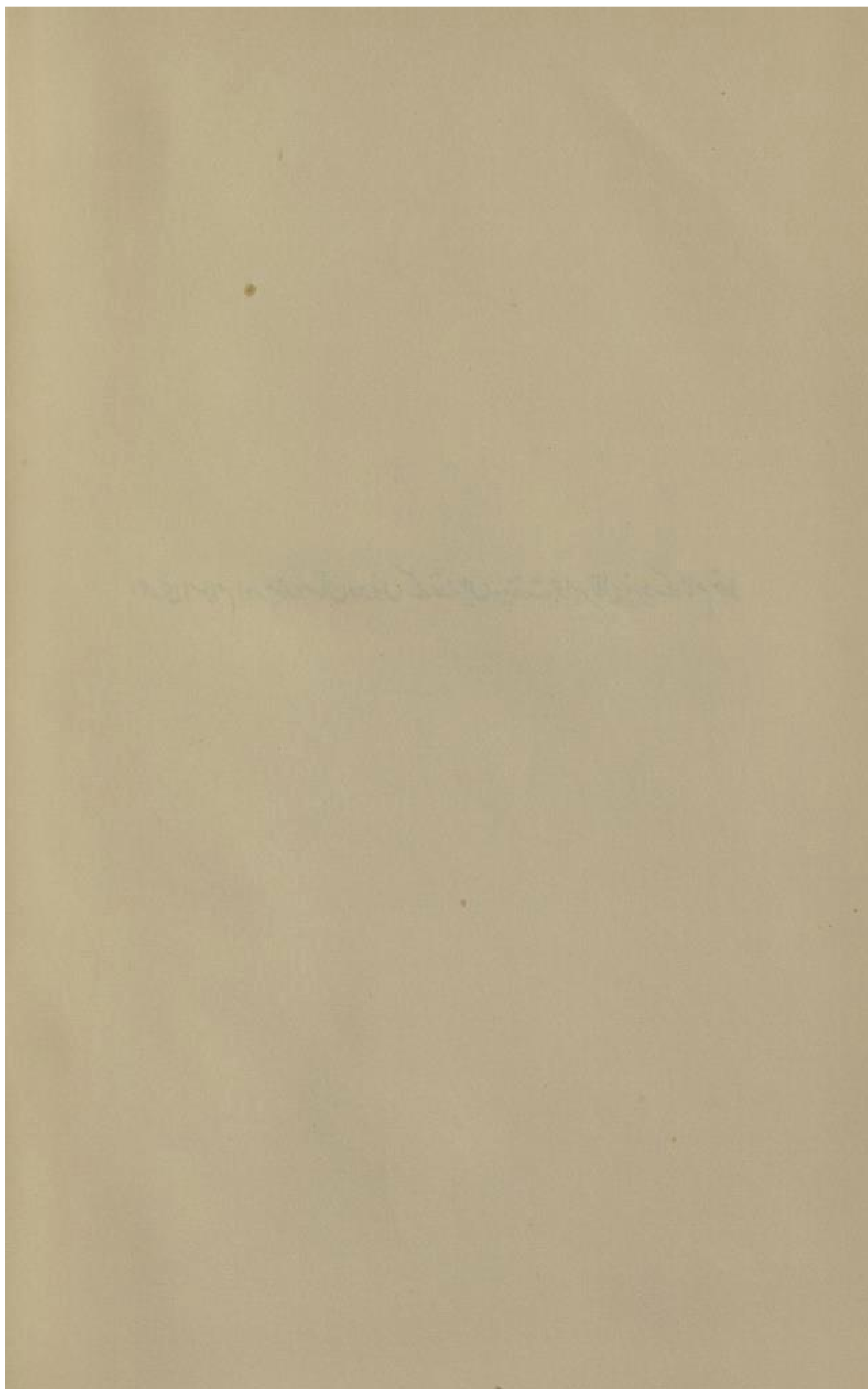
باب سوم

فتنۂ قادیانیّت اور مکاتیبِ اقبالؒ

ہو اگر قوّتِ فرعون کی درپردہ مُرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وُہ کلیم اللّٰہی!

"ضربِ کلیم"

احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط



۲۱ جون ۱۹۳۶ء

ڈیر پنڈت جواہر لال!

کل آپ کا مُرسلہ خط ملا، جس کے لیئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ میں نے جب آپ کے تحریر کردہ مضامین کا جواب لکھا تو میرا گمان تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویّہ کا علم نہیں۔ میرے اِن جوابات کے لکھنے کی بنیادی وجہ فی الحقیقت اس بات کو ظاہر کرنا اور خاص طور سے آپ پر یہ واضح کرنا تھا کہ مسلمانوں کے اندر جذباتِ وفاداری کیسے پیدا ہوئے اور یہ کہ احمدیت نے اُن کے لیئے الہامی بنیاد کس طرح فراہم کی؛ ان مضامین کی اشاعت کے بعد میرے لیئے یہ انکشاف انتہائی حیران کُن تھا کہ خود مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی اُن تاریخی وجوہات سے ناواقف ہے، جنہوں نے احمدی تعلیمات کو تشکیل کیا۔ علاوہ ازیں پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بسنے والے آپ کے ساتھی بھی آپ کے ان مضامین کے باعث بے چینی محسوس کرتے تھے، کیونکہ اُن کے خیال میں آپ کی ہمدردیاں احمدیہ تحریک کے ساتھ تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ کے اِن مضامین سے احمدی ازحد خوشی محسوس کرتے تھے (اور) احمدی پریس خاص طور پر آپ کے خلاف اس غلط فہمی کو پھیلانے کا مُوجب تھا۔ بہرحال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میری آپ کے متعلق رائے غلط تھی۔ میں بذاتِ خود مذہبی معاملات میں نہیں اُلجھتا مگر احمدیوں سے خود انہیں کے میدان میں مقابلہ کرنے کی خاطر مجھے اِس بحث میں حصّہ لینا پڑا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اِن مضامین کو لکھتے وقت ہندوستان اور اسلام کی بہتری میرے پیشِ نظر تھی اور میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شُبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام

○ یہ تاریخی خط جیسا کہ اس کی تاریخ سے ظاہر ہے، ۲۱ جون ۱۹۳۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کے نام لکھا گیا۔ اس خط میں حضرت علامہؒ نے "اسلام اور احمدیت" کے عنوان سے پنڈت جی کے جواب میں لکھے گئے اپنے ایک مضمون کے مقاصدِ تحریر کو واضح کیا ہے۔ اصل خط حضرتِ علامہؒ نے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔

اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں [۱]

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے لاہور میں آپ سے ملنے کا موقعہ گنوا دیا۔[۲] میں اُن دنوں اتنا بیمار تھا کہ اپنے کمرہ سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ میں اپنی بیماری کے باعث تقریباً ریٹائرمنٹ کی زندگی گذار رہا ہوں۔ آئندہ آپ جب لاہور آئیں تو مجھے اپنی آمد سے ضرور مطلع کریں۔ کیا آپ کو میرا شہری آزادی کے متعلق خط مِل گیا ہے؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اُس کے ملنے کی اطلاع نہیں دی اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ وُہ خط آپ تک پہنچ نہیں پایا۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

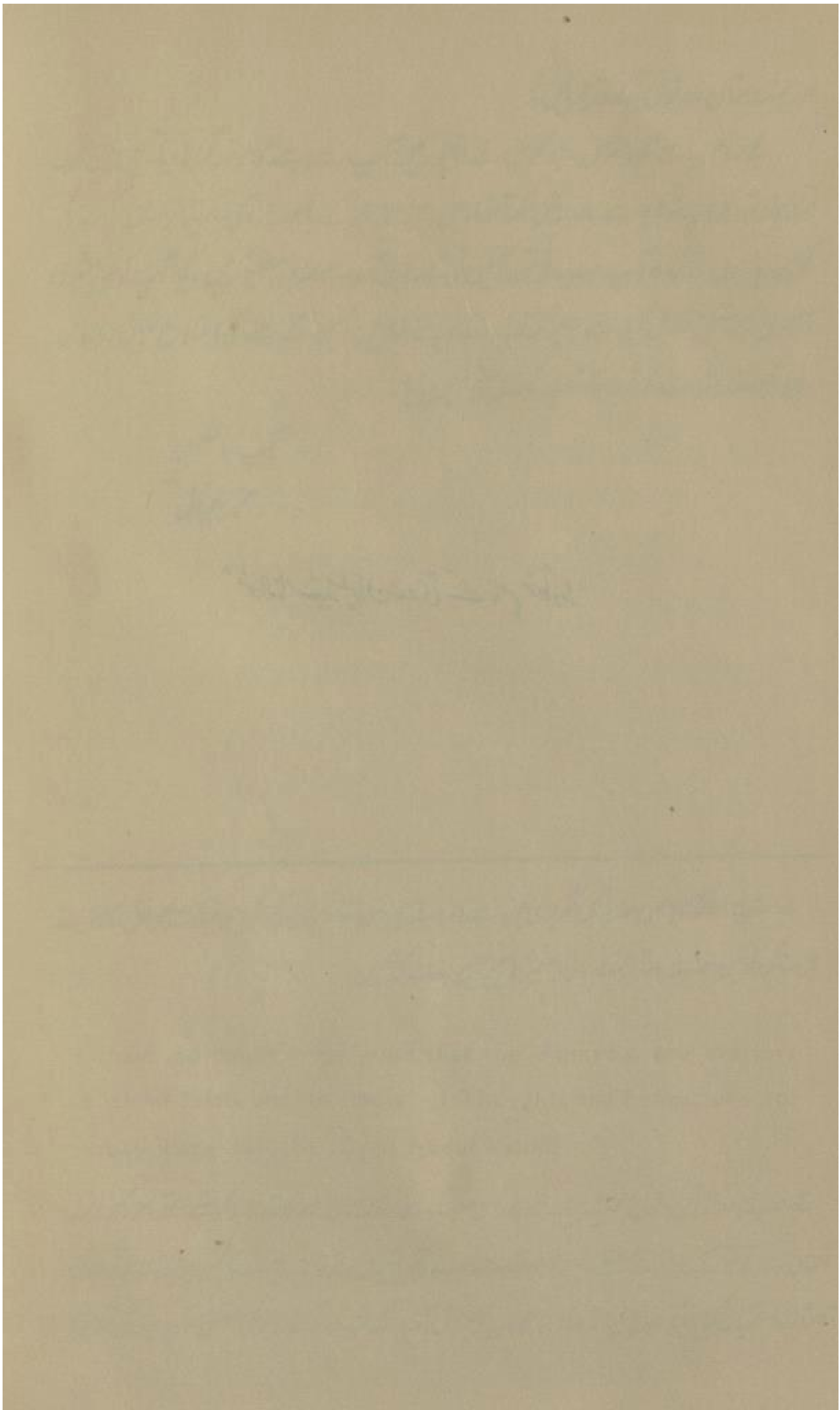
---

[۱] حضرت علامہؒ کا اصل خط چونکہ انگریزی میں ہے اس لیے ہم اس مقام پر اُن کی انگریزی عبارت بھی نقل کئے دیتے ہیں۔ تاکہ قارئین حضرت علامہؒ کے مافی الضمیر کا صحیح صحیح اندازہ کر سکیں۔

I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India' ('Thoughts and Reflections' of Iqbal Page 306, By Syed Abdul Vahid)

[۲] حضرتِ علامہؒ اُن دنوں سخت بیمار تھے اور اسی سبب سے پنڈت جی سے ملاقات نہ کر سکے تھے، جو اُن دنوں اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ یہ وہی موقعہ ہے جب قادیانیوں نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پنڈت جواہر لال نہرو کا شاندار استقبال کیا اور "جواہر لال زندہ باد"، "محبوبِ قوم خوش آمدید" کے نعرے لگائے۔ (بحوالہ الفضل قادیان مورخہ ۱۴ مئی ۳۶ء)

’مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام خطوط‘



۱۰

لاہور

۲۰ اپریل ۱۹۲۲ء

مخدومی! السلام علیکم!

ایک عرصہ سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا۔ دو باتیں دریافت طلب ہیں،

۱۔ متکلمین میں سے بعض نے علم مناظر و مرایا کے رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رُویت ممکن ہے۔ یہ بحث کہاں ملے گی؟ میں اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

۲۔ مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے ؎

ہر کجا ہنگامۂ عالم بُوَد
رحمۃً للعالمینے ہم بُوَد

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے[1]۔ اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخ اشراق تناسخ کے ایک

○ حضرت علامہؒ کے ان خطوط کا پس منظر "سخنہائے گفتنی" میں صفحہ نمبر ۲۱ پر گزر چکا ہے۔

[1] اس معنیٰ کا ایک اثر بھی تفسیروں میں مروی ہے جو اثرِ ابن عباسؓ کے نام سے ہے۔ اس اثر کی تاویل و تشریح میں مولانا محمد قاسم صاحب کا رسالہ تحذیر الناس فی اثرِ ابن عباسؓ، اور مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کا ایک مضمون ہے جو اس بحث میں دیکھنے کے قابل ہے۔ (ندوی)

شکل میں قائل تھے، اُن کے اس عقیدہ کی وجہ یہی تو نہ تھی[1]؟ میں نقرس کی وجہ سے دو ماہ کے قریب صاحبِ فراش رہا۔ اب کچھ افاقہ ہوا ہے۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[2]

والسلام
مخلص
محمد اقبال

---

[1] یہ وجہ نہیں۔ شیخ اشراق ایرانی فلسفہ سے متاثر تھے اور وہاں سے یہ خیال اُن تک پہنچا تھا۔ دیکھئے "شرح کلمۃ الاشراق" مقالہ خامسہ

[2] "مکاتیب اقبال" ج ۱ ص ۱۱۶ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم۔ اے

۲—

لاہور

۱۶ ستمبر ۱۹۳۴ء

مخدومی مولینا، السلام علیکم

یہ خط اعظم گڈھ کے پتہ پر لکھتا ہوں، معلوم نہیں کہ آپ ابھی علی گڑھ ہی میں ہیں یا وہاں سے واپس آ گئے۔ راغب اصفہانی نے 'مفردات' میں لفظ نبی کی تشریح میں لکھا ہے کہ لفظِ نبی کے دو معنی ہیں۔ خبر دینے والا، اور بلند مقام پر کھڑا ہونے والا۔ اوّل الذکر نبی ہمزہ کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزہ کے، اس ضمن میں راغب نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے۔ یعنی حضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ میں نبی بغیر ہمزہ کے ہوں۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں ہے یا نہیں [۱]؟

قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے اُن میں سے کون سے نبی با ہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب بغیر ہمزہ ہیں [۲]؟

......(یہ) سوال بڑا اہم ہے۔ کیونکہ اگر قرآنی انبیاء یا حضور رسالتمآب نبی بغیر ہمزہ ہیں تو لفظ نبی کا انگریزی ترجمہ Prophet جس کے معنی خبر دینے والا کے ہیں کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا [۳]......! والسلام

مخلص

محمد اقبال

---

[۱] یہ حدیث صحاح میں نہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس لیے نبیؐ کہنے سے منع فرمایا کہ لغت کی رُو سے منصبِ نبوت کے لیے نبیؐ لفظ ہے نبیؐ نہیں۔ (ندوی) [۲] یقیناً سب کے سب نبی بلا ہمزہ کے ہیں (ندوی)

[۳] 'مکاتیبِ اقبال' ص ۱۸۶، شیخ عطاء اللہ ایم اے

۳—

بھوپال شیش محل
۱۹ جولائی ۱۹۳۵ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب

السلام علیکم!

میں گلے کے برقی علاج کے لیئے کچھ مدت کے لیئے بھوپال میں مقیم ہوں۔ اس خط کا جواب یہیں مذکورہ بالا پتہ پر عنایت فرمایئے۔

۱۔ کیا فقہ اسلامی کی رُو سے توہینِ رسول قابلِ تعزیر جُرم ہے[۱] اگر ہے تو اس کی تعزیر کیا ہے[۲]؟

۲۔ اگر کوئی شخص جو اسلام کا مُدعی ہے یہ کہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو حضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جُزوی فضیلت حاصل ہے اس واسطے کہ مرزا قادیانی ایک زیادہ متمدن زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں تو کیا ایسا شخص توہینِ رسول کے جُرم کا مرتکب ہے؟ بالفاظِ دیگر اگر توہینِ رسول جُرم قابلِ تعزیر ہے تو عقیدۂ مذکور توہینِ رسول کی حد میں آتا ہے یا نہیں[۳]؟

---

[۱] بے شبہ (ندوی)

[۲] تعزیر حسبِ رائے امام قید سے لے کر قتل تک۔ (ندوی)

[۳] حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو جزوی فضیلت حاصل ہونا جائز ہے اور ایسا کہنا نہ کُفر ہے نہ توہینِ نبی کا باعث ہے۔ البتہ مقتضائے محبت کے خلاف ہے اور پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ جُزوی فضیلت حقیقت میں فضیلت کے شمار میں ہے بھی؛ مثلاً زیادہ متمدن زمانہ میں ہونا کوئی فضیلت نہیں کیونکہ خود تمدن نہ کوئی دینی فضیلت ہے نہ اخلاقی نہ عقلی بلکہ ممکن ہے کہ اس کے بعد اور بھی دُنیا زیادہ متمدن ہو جائے تو اِس زمانہ کے

۳۔ اگر توہینِ رسول کی مثالیں کُتبِ فقہ میں مذکور ہوں تو مہربانی فرما کر اُن میں سے چند تحریر فرمائیے، کتاب کا حوالہ بقید صفحہ تحریر فرما کر ممنون فرمائیے[1]

اُمید ہے کہ اس عریضہ کا جواب جلد ملے گا۔ زیادہ کیا عرض کروں، میری صحت پہلے سے بہتر ہے۔ اُمید ہے کہ اس دفعہ کے علاج سے زیادہ فائدہ ہوگا[2]

والسلام
مخلص
محمد اقبال (لاہور)
حال وارد بھوپال

آدمی پر بھی اُس زمانہ کے آدمی کو فوقیت ہو جائے اور اگر یہ امر باعثِ فضیلت ہو تو غلام احمد قادیانی کیا اقبال سیالکوٹی کو بھی یہ جزوی فضیلت حاصل ہے بلکہ غلام احمد سے زیادہ۔ کیونکہ مرزا صاحب نے صرف اس کو دور سے دیکھا ہے، چکھا اور آزمایا نہیں۔ (ندوی)

[1] یہ نقلِ کُفر مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ "السیف المسلول علیٰ شاتم الرسول" دیکھ لیجئے۔ (ندوی)

[2] "مکاتیبِ اقبال" ج ۱ ص ۱۸۲ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم۔ اے

۴

بھوپال، شیش محل
یکم اگست ۱۹۳۵ء

مخدوم مکرم جناب مولینا!

السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے۔ جس کے لیئے سراپا سپاس ہوں۔ چند امور اور بھی دریافت طلب ہیں اُن کے جواب سے بھی ممنون فرمایئے[1]

۱۔ تکملۂ مجمع البحار، صفحہ ۸۵ میں حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ حضور رسالمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خاتم النبیین کہو، لیکن یہ نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوگا[2]

مہربانی کرکے کتاب دیکھ کر یہ فرمایئے کہ آیا اس قول کے اسناد درج ہیں اور اگر ہیں تو آپ کے نزدیک ان اسناد کی حقیقت کیا ہے؟

---

[1] اُس وقت وُہ (علامہ مرحوم) ردِ قادیانی پر اپنا مضمون تیار کر رہے تھے۔ (ندوی)

[2] جی ہاں! اس کتاب میں یہ روایت ہے، جو مصنف ابن ابی شیبہ سے لی گئی ہے لیکن اس کی سند مذکور نہیں جو روایت کی صحت وسقم کا پتہ لگایا جاتے اور اگر صحیح ہو بھی تو یہ حضرت عائشہؓ کی محض رائے ہے۔ کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بار بار خود فرمایا ہے لانبی بعدی میرے بعد کوئی نبی نہیں حضرت عائشہؓ نے اپنے خیال میں اس لیے ایسا کہنے سے منع کیا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول کا انکار اس سے لوگ نہ سمجھنے لگیں۔ بہرحال یہ اُن کا خیال ہے جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قول کے خلاف ہو۔ (ندوی)

ایسا ہی قول دُرِ منثور، جلد پنجم صفحہ ۲۰۴ میں ہے، اس کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے[1]۔ میں نے یہاں بھوپال میں یہ کتب تلاش کیں افسوس اب تک نہیں ملیں۔

۲۔ 'حجج الکرامہ' صفحہ ۴۲۷ - ۴۳۱ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے۔ 'مَنْ قَالَ بِسَلْبِ نُبُوَّتِهٖ كَفَرَ حَقًّا' اس قول کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہے[2]؟

۳۔ 'لَوْ عَاشَ اِبْرَاهِيْمُ لَكَانَ نَبِيًّا' اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ نووی اسے معتبر نہیں جانتا۔ مُلّا علی قاری کے نزدیک معتبر ہے۔ کیا اس کے اسناد درست ہیں[3]؟

---

[1] جی ہاں وہی روایت بحوالہ مصنف ابنِ ابی شیبہ اس کتاب میں بھی ہے اور اس کی نسبت پہلے لکھ چکا ہوں۔ (ندوی)

[2] 'حجج الکرامہ فی آثار القیامہ' نواب صدیق حسن خاں کی کتاب ہے۔ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمدِ ثانی بصفتِ نبوت ہوگی یا بلا صفتِ نبوت۔ اس باب میں علماء کا اختلاف ہے۔ نواب صاحب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وُہ بصفتِ نبوت ہوگی اس لیے وُہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کی آمدِ ثانی میں ان کی صفتِ نبوت کا انکار کرتے ہیں وُہ مرتکبِ کلمۂ کفر ہیں۔ بہر حال یہ رائے ہے۔ (ندوی)

[3] یہ ابنِ ماجہ کی روایت ہے۔ اس روایت کو بعض محققین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرضاً ہے واقعہ نہیں، کیونکہ لَوْ فرض اور عدم وقوع کے لیے آتا ہے، اسی سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس لیے ابراہیم بن محمدؐ کو بچپن ہی میں اُٹھا لیا گیا۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں یہی مذکور ہے۔ چنانچہ خود ابنِ ماجہ میں اور بخاری میں ہے وَلَوْ قَضٰى اَنْ يَّكُوْنَ بَعْدَ مُحَمَّدٍ نَبِيٌّ لَعَاشَ اِبْنُهٗ وَلٰكِنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ (ابنِ ماجہ، جنائز۔ بخاری، انبیاء) یعنی یہ کہ اگر فیصلہ الٰہی یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپ کے صاحبزادہ زندہ رہتے لیکن یہ فیصلہ الٰہی ہو چکا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ ملا علی قاری نے اس کو موضوعات میں لیا ہے، اس کو معتبر نہیں کہا ہے، ضعیف کہا ہے۔ اس میں ابو شیبہ ابراہیم راوی ضعیف ہے۔ بلکہ وُہ متروک الحدیث، منکر الحدیث، باطل گو اور دروغ گو تک کہا گیا

۴۔ "بخاری" کی حدیث وَ اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ میں واؤ حالیہ ہے کیا؟[1] اگر حالیہ ہو تو اس حدیث کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے دوبارہ آنے سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ جس وقت وُہ آئیں گے مسلمانوں کا امام خود مسلمانوں میں سے ہوگا۔

۵۔ ختمِ نبوّت کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے۔

زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

والسّلام

مخلص

محمد اقبال[2]

ہے۔ اس کے بعد بشرطِ صحت مُلّانے اس کی تاویل کی ہے۔ بہرحال اس حدیث کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث کا ہے لَوْ کَانَ بَعْدِی نَبِیًّا لَکَانَ عُمَرُ (مسند احمد۔ ترمذی) یعنی یہ کہ اگر میرے بعد نبی ہونا ممکن ہوتا تو عمرؓ بن خطاب نبی ہوتے لیکن چونکہ ممکن نہیں اس لیے نہ وُہ اور نہ کوئی اور نبی ہو سکتا ہے۔ (ندوی)

[1] صحیح یہی ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ عیسائیوں پر حجت ہوں گے اور مسلمانوں کی تائید فرمائیں گے۔ مسلمانوں کا امام الگ ہوگا۔ حضرت عیسٰی (علیہ السّلام) نہ ہوں گے۔ (ندوی)

[2] "مکاتیبِ اقبالؒ" ج ا صفحہ ۱۹۱ تا ۱۹۴ مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ایم۔ اے

۵—

بھوپال
۲۳ اگست ۱۹۲۲ء○

مخدوم مکرم جناب مولینا!

السلام علیکم

ایک عریضہ لکھ چکا ہوں، اُمید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گذرا ہوگا۔ ایک بات دریافت طلب رہ گئی تھی جو اَب عرض کرتا ہوں۔

کیا عُلمائے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو حیات و نزولِ مسیح ابن مریم (علیہما السلام) کے مُنکر ہوں؟ یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلہ میں کیا مذہب ہے[1]؟ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ میں ۲۸ اگست کی شام کو رُخصت ہوجاؤں گا۔ علاج کا کورس اس روز صُبح ختم ہوجائے گا۔ اِس خط کا جواب لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیے۔

والسلام
مخلص محمد اقبال[2]

○ کتاب میں سن یہی درج ہے۔ مگر خطوط کی سن وار ترتیب کو دیکھتے ہوئے یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ صحیح سن ۲۵ء ہے۔ جسے کاتب نے غلطی سے ۲۲ء کر دیا۔ (مرتب)

[1] مجھے جہاں تک علم ہے نزولِ مسیح (علیہ السلام) کا انکار کسی نے نہیں کیا۔ معتزلہ کی کتابیں نہیں ملتیں جو حال معلوم ہو۔ البتہ ابنِ حزم وفاتِ مسیح (علیہ السلام) کے قائل تھے ساتھ ہی نزول کے بھی (ندوی)

[2] "مکاتیبِ اقبال"، ج ۱ ص ۱۹۶ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم۔اے

۶ —

لاہور

۷ر اگست ۱۹۳۶ء

مخدومی، السلام علیکم!

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھے۔ میری صحت کی حالت بہ نسبتِ سابق بہتر ہے۔ گو آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ موسمِ سرما میں وُہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا، جس کا وعدہ میں نے اعلیٰحضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس میں آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے، بدور البازغہ بھی اسی مطلب کے لیئے منگوائی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانینِ اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی ضرورت ہے[1]۔ اس کے متعلق جو جو کُتب آپ کے ذہن میں ہیں مہربانی کر کے اُن کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمایئے اور یہ بھی فرمایئے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی؟

الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں[2] مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ اگر آپ کی صحت اجازت دے تو آپ بھی اس پر ایک جامع و نافع بیان شائع فرمایئے[3]۔ میں بھی تیسرا بیان انشاء اللہ جلد لکھوں گا اس کا موضوع ہوگا "بروز"۔ لفظِ بروز کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ

---

[1] افسوس حضرتِ علامہؒ کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کتاب عدم سے وجود میں نہ آسکی۔

[2] مولانا ابوالکلام آزادؒ کے یہ بیانات تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے کہیں نہیں مل سکے ہیں۔ اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہوں تو وہ مطلع فرمائیں۔ مرتب اُن کا شکر گزار ہوگا۔

[3] اِس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرتِ علامہؒ کو فتنۂ قادیانیت کے استیصال سے کس قدر گہری دلچسپی تھی

کے ذہن میں ہو یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتہ دیجیے[1] نہایت شکر گذار ہوں گا۔[2]

والسلام
مخلص
محمد اقبال[3]

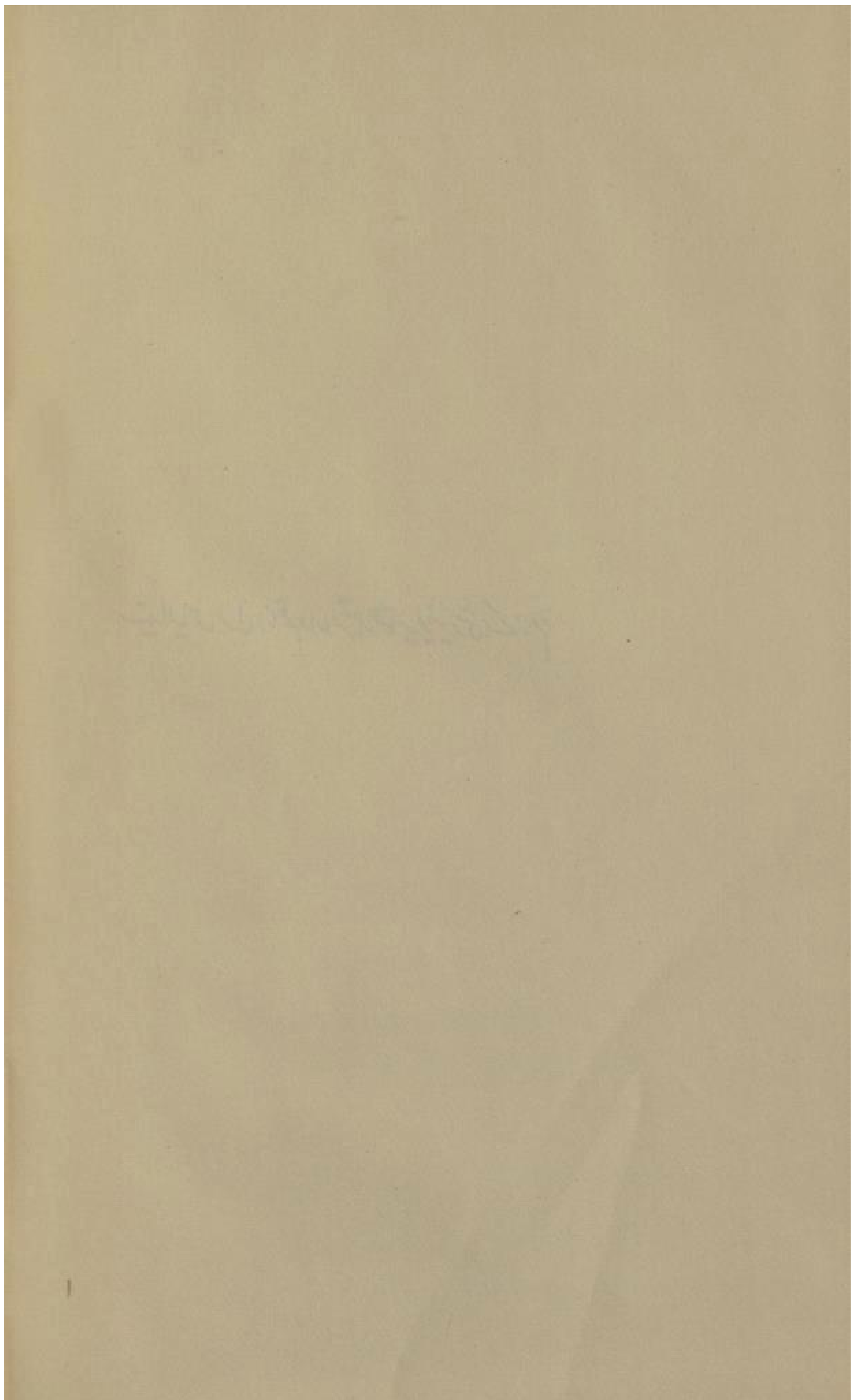
---

[1] علامہ ندوی نے جواب میں لکھا "لفظِ بروز کے معنیٰ نو ظہور کے ہیں مگر اس کے اصطلاحی معنیٰ ملاحدۂ عجم کی پیداوار ہیں" ملاحظہ ہو "مکاتیبِ اقبال" ج ۱ حاشیہ ص ۱۹۹

[2] جہاں تک مرتب کو معلوم ہے۔ حضرتِ علامہؒ اپنی بیماری کے سبب، اپنے اس ارادے کو کبھی عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے۔ بہر حال اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کے پیشِ نظر قادیانی فتنے کے سبھی چہرے تھے اور وُہ چاہتے تھے کہ ایک ایک کر کے اُن تمام سے نقاب اُلٹ دی جائے۔

[3] "مکاتیبِ اقبال" ج ۱ ص ۲۰۰-۱۹۹ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے

سیّد الیاس برنی (ناظم دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی) کے نام خط



۱۰

لاہور

۶؍جون ۱۹۳۶ء

مخدومی جناب پروفیسر صاحب!

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ کتاب 'قادیانی مذہب' اس سے بہت پہلے موصول ہو گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بے شمار لوگوں کے لیئے چراغِ ہدایت کا کام دے گی اور جو لوگ قادیانی مذہب پر مزید لکھنا چاہتے ہیں اُن کے لیئے تو یہ ضخیم کتاب ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ جس سے اُن کی محنت و زحمت بہت کم ہو گئی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں مفصل خط لکھتا مگر دو سال سے بیمار ہوں۔ اور بہت کم خط و کتابت کرتا ہوں۔ اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

حضور نظام[1] کا خط میری نظر سے گذرا تھا۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ جو روپیہ اُن کی گورنمنٹ کی طرف سے پنجاب میں آتا ہے وُہ یا تو پارٹی پالیٹکس پر صرف ہوتا ہے یا اُن اخباروں پر جو قادیانیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے؟ میں نے یہ بات آپ کو بصیغۂ راز لکھ دی ہے۔

والسلام

مخلص محمد اقبال[2]

---

٥ جن دِنوں حضرتِ علامہؒ قادیانیت کی بیخ کنی میں مصروف تھے، اُنہی دنوں میں پروفیسر الیاس برنی مرحوم نے 'قادیانی مذہب' کے نام سے قادیانی معتقدات کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا کہ وہ بالکل ننگا ہو کر سامنے آ گئی۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مرحوم نے حضرتِ علامہؒ کی خدمت میں بھی بھیجا اور شاید اس پر حضرتِ علامہؒ کی رائے چاہی۔ جواب میں آپ نے مذکورہ خط لکھا۔

[1] نظام حیدر آباد دکن

[2] 'مکاتیبِ اقبال' ج ۱ ص۴۲۵ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے

۲—

جاوید منزل
۲۷ مئی ۱۹۳۷ء

جناب پروفیسر صاحب!

السلام علیکم!

آپ کی کتاب "قادیانی مذہب" کی نئی ایڈیشن جو آپ نے بکمال عنایت ارسال فرمائی ہے، مجھے مل گئی ہے۔ جس کے لیئے بے انتہا شکر گذار ہوں۔ میں نے سید نذیر نیازی ایڈیٹر "طلوعِ اسلام" سے سنا ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہو رہی ہے۔ آپ کی محنت قابلِ داد ہے کہ اس سے عامۃ المسلمین کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے اور آئندہ پہنچتا رہے گا۔ اب ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے جو کہ آپ کے ذاتی افکار کا نتیجہ ہو۔ آپ کے قلم سے مسلمان ایسی توقع رکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ قادیانی تحریک یا یوں کہیئے کہ بانی تحریک کا دعویٰ مسئلہ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ مذکور کی تحقیق تاریخی لحاظ سے ازبس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیل اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ میری رائے ناقص میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

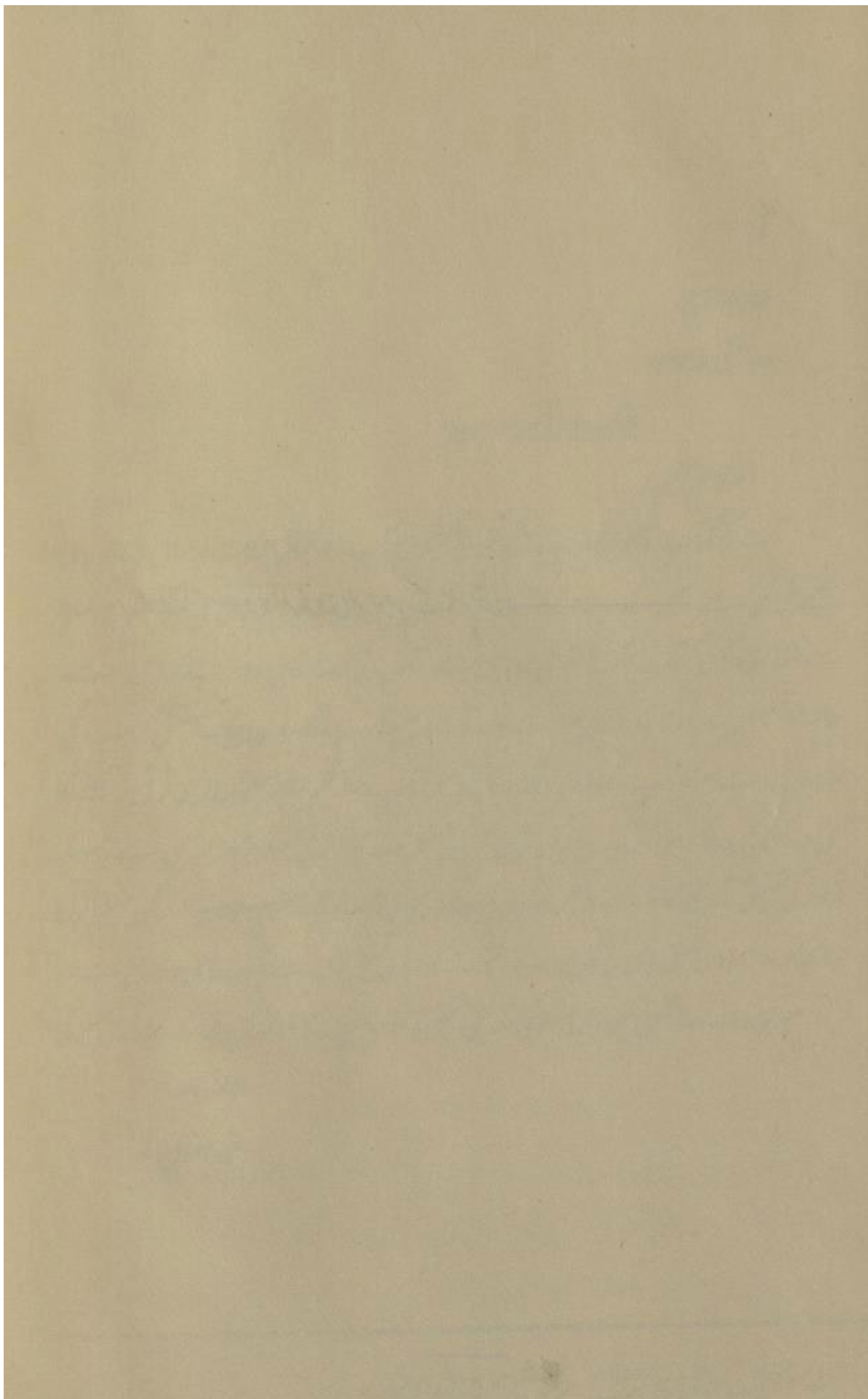
والسلام

محمد اقبال[1]

---

[1] "مکاتیبِ اقبال" ج ۲ ص ۱۹۱ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام خط ——————



لاہور

۵؍ فروری ۱۹۳۶ء

مخدومی مولینا!

السلام علیکم!

پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں میں نے جو کچھ لکھا تھا اس کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں بھجوائی گئی تھی مہربانی کر کے مطلع فرمائیے کہ وہ پمفلٹ آپ تک پہنچا یا نہیں؟

اخباروں میں مولینا سید سلیمان کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا تعالیٰ ان کو دیر تک سلامت رکھے۔ ان کا وجود اس ملک میں غنیمت ہے۔ میری طرف سے بہت بہت سلام ان کی خدمت میں عرض کیجئے۔ کسی گذشتہ خط میں (جو اس وقت نہیں مل سکا) انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ ایک اسلامی ملک کے امیر کو اختیار ہے کہ اگر کسی ایسے امر میں جس کی شرع نے 'اجازت' دی ہو فساد پیدا ہو تو اس اجازت کو Revoke کر لے۔ اس کی مثالیں بھی مولینا نے خلافتِ راشدہ کے زمانہ کی لکھی تھیں۔ اس قول کے لیے حوالے کی ضرورت ہے۔ مہربانی کر کے آپ خود، مولینا موصوف سے دریافت کر کے تحریر فرمائیں۔ میں نے خود اِدھر اُدھر سے تفحص کر کے حوالہ نکالا تھا مگر افسوس کہ اب وہ کاغذ جس پر یہ سب کچھ نوٹ کیا تھا نہیں ملتا۔

اُمید کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں۔ مولینا کی خدمت میں سلام شوق عرض کریں

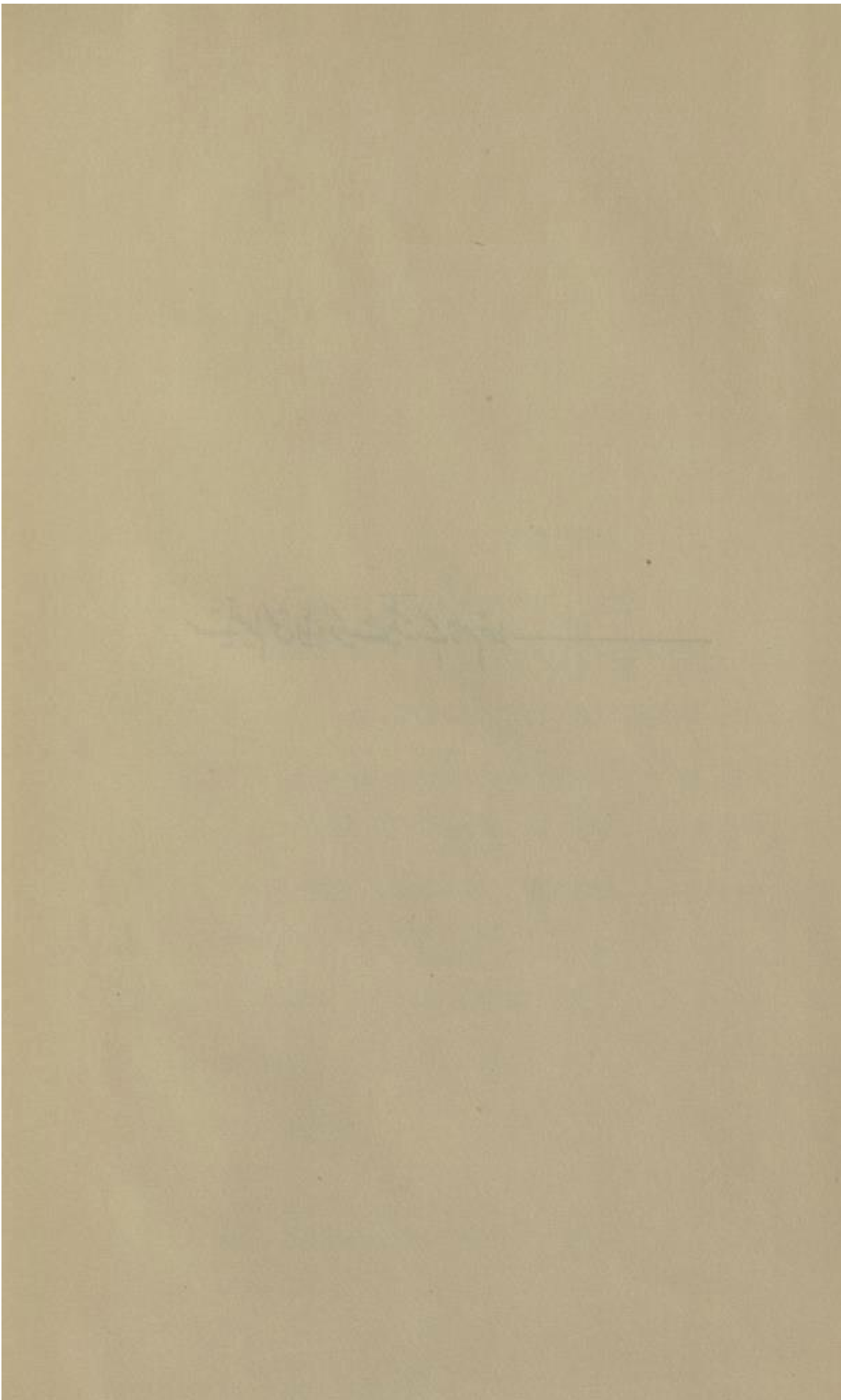
مخلص محمد اقبالؒ[1]

اس خط کے جواب کی طرف جلد توجہ فرمائیے تو ممنون ہوں گا

---

[1] "مکاتیبِ اقبال" ج ۱ ص ۲۲۲، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے

سید نعیم الحق ایڈووکیٹ پٹنہ کے نام خط ــــــــــــــــ



لاہور°

۹ر فروری ۱۹۳۴ء

مائی ڈیر مسٹر نعیم الحق

نوازشنامہ موصول ہوا۔ جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ جس مقدمہ کی پیروی کے لیے میں نے آپ سے درخواست کی تھی اس کی پیروی چودہری ظفر اللہ خاں[1] کریں گے۔ عبدالحمید صاحب نے مجھے یہ اطلاع دی ہے اور میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو ہر قسم کی زحمت سے بچانے کے لیے مجھے فی الفور آپ کو مطلع کرنا چاہیئے۔

چودہری ظفر اللہ خاں کیونکر اور کس کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں مجھے معلوم نہیں۔ شاید 'کشمیر کانفرنس' کے بعض لوگ ابھی تک قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں۔ میں اُس تمام زحمت کے لیے جو آپ برداشت کر رہے ہیں اور اس تمام ایثار کے لیے جو آپ گوارا فرما رہے ہیں بے حد ممنون ہوں۔ اُمید ہے آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص محمد اقبال[2]

° علامہ اقبالؒ اور مجلس احرار کی بروقت مداخلت اور کامیاب مزاحمت کے سبب قادیانیوں نے ۱۹۳۱ء کی تحریکِ کشمیر کو اپنے ہاتھوں سے نکلتا ہوا دیکھ کر اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ جس طرح اس تحریک کو ناکام بنانا چاہا مندرجہ بالا خط اس کی پوری پوری نشاندہی کرتا ہے۔ حضرتِ علامہ نے یہ خط پٹنہ کے ایک معروف وکیل جناب سید نعیم الحق صاحب کے نام لکھا جنہوں نے اُس دور میں مظلومینِ کشمیر کی بلامعاوضہ قانونی معاونت کی تھی۔

[1] یہ وہی ظفر اللہ خاں ہیں جنہیں بعد از تقسیم پاکستان کا پہلا وزیرِ خارجہ مقرر کیا گیا

[2] مکاتیب اقبال ج ۱ ص ۳۵۴ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم اے

باب چہارم

توضیحات

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ !

ضربِ کلیم

'لائٹ' کے جواب میں

'لائٹ' نے اپنے الزام کی بنیاد میرے اس شعر پر رکھی ہے ٥

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

یہ سلیس اُردو ہے، جس کا مطلب محض یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی میں ہم کلامی سے آگے بھی ایک منزل ہے۔ لیکن شعر کو وحی کے دینی معانی سے کچھ تعلق نہیں۔ اس سلسلہ میں 'لائٹ' کی توجہ اپنی کتاب 'تشکیلِ نو' کی طرف مبذول کراؤں گا۔ جہاں صفحہ ۱۲۱ پر میں نے لکھا ہے کہ:

'احساس اور تخیل کے فطری رشتہ سے وحی کے متعلق اس اختلا… روشنی پڑتی ہے، جس نے مُسلم مفکرین کو کافی پریشان کیا تھا۔ غیر واضح احساس اپنے مُنتہا کو تخیل ہی اندر پاتا ہے اور خود تخیل لباسِ مجاز میں آنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ محض استعارہ نہیں ہے کہ تخیل اور لفظ دونوں بیک وقت بطنِ احساس سے پیدا ہوتے ہیں، اگرچہ ادراک اُنہیں وجود میں لاکر خود اپنے لیے یہ دشواری پیدا کرتا ہے کہ اُنہیں ایک دوسرے سے مختلف قرار دے اور ایک معنیٰ میں لفظ بھی الہام ہوتا ہے[1]'

---

٥ حضرتِ علامہؒ کے بیان 'قادیانی اور جمہور مسلمان' پر تنقید کرتے ہوئے ایک قادیانی میگزین 'لائٹ' Light لاہور نے لکھا کہ 'اور بہت سے بڑے مفکروں کی مانند ڈاکٹر اقبال بھی الہام پر یقین نہیں رکھتے' اس اتہام کے متعلق جب ایک پریس کے نمائندہ نے حضرتِ علامہؒ سے سوال کیا تو آپ نے مذکورہ وضاحت فرمائی۔

(حرفِ اقبال، صنہ ۱۲۰)

[1] 'حرفِ اقبال' صنہ ۱۲۰ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے

۲ ۔ ○

مدیر 'لائٹ' نے ایک ایسی حدیث کا حوالہ دیا ہے جو تاریخی عمل کی نہایت حسابی تصویر پیش کرتی ہے۔ میں اگرچہ انسان کے رُوحانی امکانات اور رُوحانی آدمیوں کی پیدائش کا قائل ہوں تاہم مجھے یقین نہیں کہ اس تاریخی عمل کا حساب ویسے ہی لگایا جاسکتا ہے جیسے 'لائٹ' کا خیال ہے۔ ہم بآسانی اعتراف کرسکتے ہیں کہ تاریخی عمل کا شعور ہماری ذہنی سطح سے بہت بلند ہے۔ میں منفی رنگ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وُہ اس طرح مقرّر اور حسابی نہیں ہے جیسے 'لائٹ' نے سمجھا ہے۔ میں ابنِ خلدون کی رائے سے بہت حد تک متفق ہوں۔ جہاں وُہ تاریخی عمل کو ایک آزاد تخلیقی تحریک تصور کرتا ہے۔ نہ کہ ایسا عمل جو پہلے سے متعیّن کیا جاچکا ہو۔ موجودہ دور میں برگساں نے اسی نظریہ کو زیادہ صحت اور عُمدہ مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ 'لائٹ' نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وُہ غالباً جلال الدین سیُوطی نے مشہور کی تھی۔ اور اسے زیادہ اہمیّت نہیں دی جاسکتی۔ بُخاری و مُسلم میں اس حدیث کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس میں چند بزرگوں کے تاریخی عمل کے نظریّہ کی جھلک ہو تو ہو، لیکن افراد کے ایسے رویا۔ کوئی دلیل نہیں بن سکتے۔ تمام مُحدّثین نے اسی اصُول کی پیروی کی ہے[1]

○ جب حضرتِ علامہؒ سے اُس حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا جس کا 'لائٹ' نے حوالہ دیا تھا اور جس میں ہر صدی کے آغاز میں ایک مجدد کے آنے کی خبر دی گئی ہے تو آپ نے مندرجہ بالا جواب ارشاد فرمایا۔

[1] 'حرفِ اقبالؒ'، صہ ۱۲۱ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے

سن رائز کے جواب میں°

مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وُہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ اس کا اُردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی اُمید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے، جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے بانیٔ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ 'براہینِ احمدیہ' میں انہوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل رُوح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود اُن لوگوں کو جو بانیٔ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت —— بانیٔ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت —— کا دعویٰ کیا گیا۔ اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سُنا۔ درخت جڑ

° جب حضرتِ علامہؒ کی توجہ، ایک دوسرے قادیانی ہفت نامے 'سن رائز' 'Sun Rise' لاہور کے ایک خط کی طرف مبذول کرائی گئی جس میں علامہ مرحوم کی ایک ۱۹۱۰-۱۱ء کی تقریر کا حوالہ دے کر اُن پر "تناقضِ خود" Inconsistency کا الزام لگایا گیا تھا، تو آپ نے مذکورہ توضیح و تصریح فرمائی۔ (حرفِ اقبال، ص ۱۲۲)

سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویّہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وُہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھُٹلا سکتے۔[1]

---

[1] "حرفِ اقبال"، صفحہ ۱۲۲ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے

۲ ○

اس سوال کا جواب 'تشکیلِ نَو' کے حوالے سے بہتر دیا جا سکے گا جہاں صفحہ ۱۲۰-۱۲۱ پر میں نے لکھا ہے:

'ختمِ نبوت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ زندگی کی انتہا بس یہ ہو کہ عقل، جذبات کی قائم مقام ہو جائے۔ یہ چیز نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ اس عقیدہ کی عقلی افادیت اتنی ہے کہ اس سے باطنی واردات کو آزاد تنقیدی رنگ ملتا ہے۔ کیونکہ اس یقین سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی تاریخ میں فوق الفطرت سرچشمہ کا منصب ختم ہو چکا۔ یہ یقین ایک نفسیاتی قوت ہے، جو ایسے منصب کی پیدائش کو روکتا ہے اور اس خیال سے انسان کے اندرونی تجربات میں علم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے 'لا اِلٰہ' فطرت کی تمام قوتوں سے الوہیت کا لباس اُتارتا ہے۔ اور انسان کے بیرونی تجربات میں تنقیدی مشاہدہ کی رُوح پیدا کرتا ہے۔ باطنی واردات خواہ وہ کتنی غیر فطری اور غیر معمولی ہو، مسلمان کے لیے بالکل فطری تجربہ ہے۔ جو دوسرے تجربات کی طرح تنقید کی زد میں آتا ہے اور یہ چیز رسولِ کریم (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم) کے رویّہ سے اور بھی روشن ہو جاتی ہے۔ جو انہوں نے ابنِ صیّاد[1] کی نفسیاتی واردات کے لیے اختیار فرمایا۔ اسلام میں تصوّف کا مقصد انہی باطنی واردات کو منظم کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابنِ خلدون ہی ایک ایسا شخص گزرا ہے۔ جس نے اسے اصولی طریقے پر جانچا'

پہلے فقرہ سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی معانی میں اولیاء یا اُن جیسی صفات کے لوگ ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ مرزا صاحب بھی اس زُمرہ

○ سوال یہ تھا الہام اور مُصلحین کے آنے کے امکانات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

[1] 'حرفِ اقبال' میں ابنِ سعید ترجمہ کیا گیا ہے، جو صحیح نہیں۔

میں شامل ہیں یا نہیں ؟ جب تک عالمِ انسانیت کی روحانی اہلیتیں برداشت کر سکتی ہیں۔ ایسے لوگ تمام قوموں اور ملکوں میں پیدا ہوں گے تا کہ وُہ انسانی زندگی کی بہتر اَقدار کا پتہ دے سکیں۔ اس کے خلاف قیاس کرنا تو انسانی تجربہ کو جُھٹلانا ہو گا۔ فرق محض اس قدر ہے کہ اب ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وُہ ان باطنی واردات پر تنقیدی نظر ڈال سکے اور باتوں کے علاوہ ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ روحانی زندگی میں، جس کے انکار کی سزا جہنم ہے، ذاتی سند ختم ہو چکی ہے۔[1]

---

[1] حرفِ اقبال، ص ۱۲۳ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔اے

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام°

مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابد الاباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے، جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار کی راہ کھولنا ہے۔ بظاہر نظریۂ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی انکارِ خاتمیت الہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے، جس کی توضیح اُس وقت ہو سکے گی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مؤرخ ہندی مسلمانوں اور بالخصوص ان کے بعض بظاہر مستعد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا۔[1]

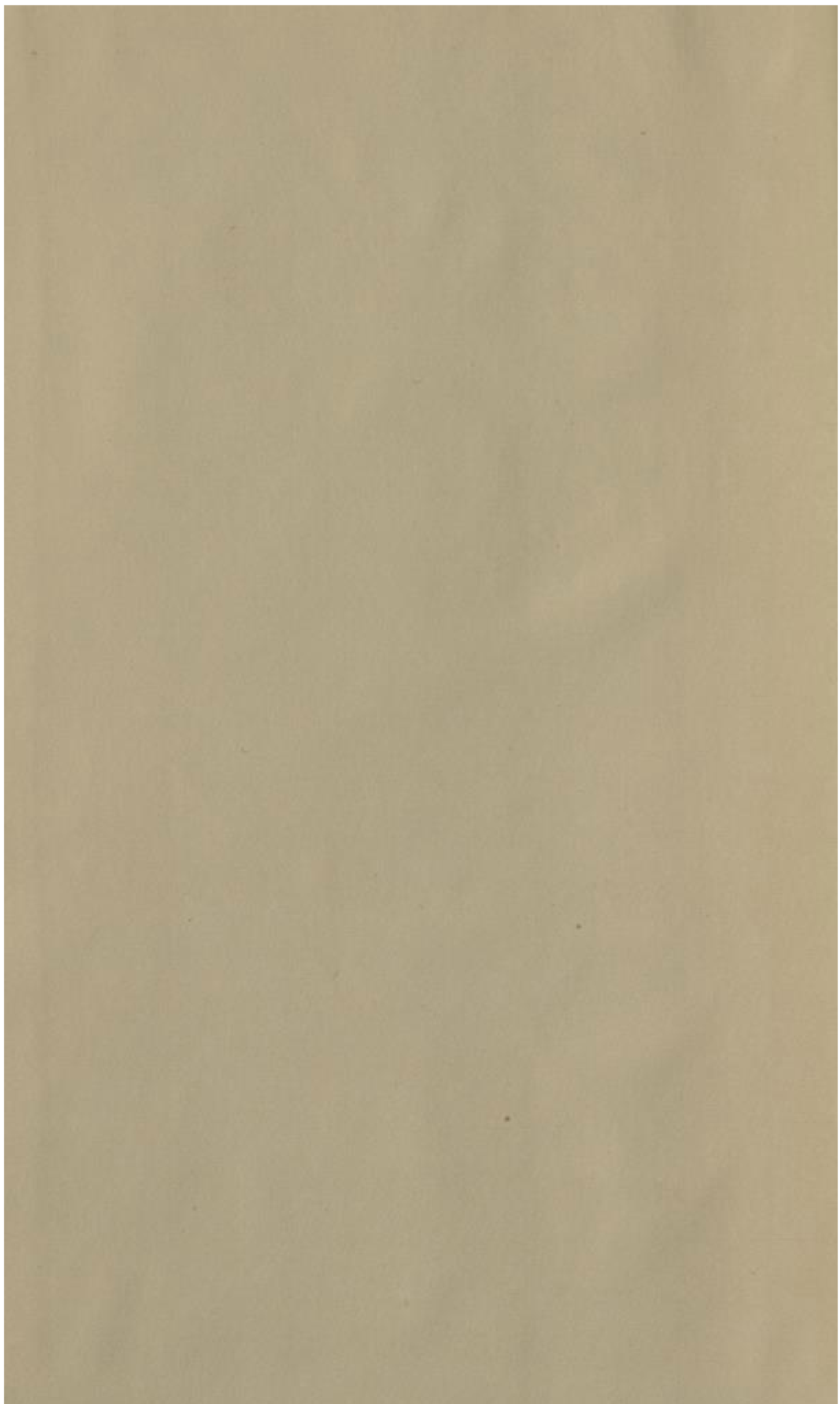
° حضرتِ علامہؒ کی زندگی کے آخری دنوں میں اُن کے اور مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے مابین اسلام اور وطنیت کے موضوع پر ایک غلط فہمی کے باعث زبردست بحث چھڑ گئی تھی۔ جس کا اختتام حضرتِ علامہؒ کے اُس خط پر ہُوا جو انہوں نے ایڈیٹر 'احسان' لاہور کو لکھا۔ یہ خط اس بحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس بحث کے دوران حضرتِ علامہؒ کا ایک طویل جوابی مضمون روزنامہ 'احسان' لاہور میں شائع ہوا۔ 'مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام' اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے۔

[1] 'حرفِ اقبالؒ'، ص ۲۲۶-۲۲۹، مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم اے۔

دین شا کے جواب میں°

مجھے اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ سوائے اس کے کہ مجھے اُن کے مرکزی خیال سے پورا اتفاق ہے۔ یعنی اسلام کی ظاہری اور باطنی تاریخ میں ایرانی عُنصر کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ یہ ایرانی اثر اس قدر غالب رہا ہے کہ سپنگلر Spengler نے اسلام پر مُوبدانہ رنگ دیکھ کر اسلام کو ہی ایک مُوبد مذہب سمجھ لیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب "تشکیلِ نو" میں کوشش کی ہے کہ اسلام پر سے اس مُوبدانہ خَول کو دُور کر دوں۔ اور مجھے اُمید ہے کہ اسی سِلسلے میں میں اپنی کتاب "قرانی تعلیم کا مقدمہ" میں مزید کام کر سکوں گا۔ مُوبدانہ تخیل اور مذہبی تجربہ مسلمانوں کی دینیات، فلسفہ اور تصوّف کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوتے ہیں۔ بہت سا مواد ایسا موجود ہے جس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ تصوّف کے چند اسکولوں نے جو اسلامی سمجھے جاتے ہیں، اس مُوبدانہ حالات و واردات کو ہی زندہ کیا ہے۔ میں مُوبد تمدّن کو انسانی تمدّن کے بے شمار مظاہرات میں سے ایک مظاہرہ سمجھتا ہوں۔ میں نے اس لفظ کو بُرے معنیٰ میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس بھی حکومت کا تصوّر تھا۔ فلسفیانہ مباحث تھے۔ حقائق بھی تھے اور غلطیاں بھی۔ لیکن جب تمدّن پر زوال آتا ہے تو اس کے فلسفیانہ مباحث، تصورات اور دینی واردات کی اشکال میں انجماد اور سکُون آجاتا ہے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو مُوبد تمدّن پر یہی حالت طاری تھی۔ اور تمدّنی تاریخ کو جس طرح میں سمجھتا ہوں۔ اسلام نے اس تمدّن کے خلاف احتجاج کیا۔ خود قرآن کے اندر شہادت موجود ہے کہ اسلام نہ محض ذہنی بلکہ مذہبی واردات کے لیئے بھی نئی راہ پیدا کرنی چاہتا تھا۔ لیکن ہماری مغانہ وراثت نے اسلام کی زندگی کو کُچل ڈالا اور اس کی اصل رُوح اور مقاصد کو اُبھرنے کا موقع نہ دیا۔[1]

° جب ایک پارسی مسٹر دین شا کے ایک خط کے متعلق جو "اسٹیٹسمین" دہلی میں شائع ہوا، حضرت علامہؒ سے پوچھا گیا تو آپ نے مذکورہ جواب دیا۔ [1] "حرفِ اقبال" صفحہ ۱۲۴ مرتبہ لطیف احمد شروانی، ایم۔ اے





مُسلِمُ اکادمیُ

کی دُوسری زیرِ طبع کتابیں !

۱۔ 'فلسفۂ ختمِ نبوت' ______ از: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

۲۔ 'صراطِ مُستقیم' ______ از: ابوالکلام آزادؒ

۳۔ 'رسولِ عربیؐ' ______ از : ابوالکلام آزادؒ

۴۔ 'فتنۂ ملتِ بیضا' ______ ترتیب : نعیم آسی

۵۔ 'مغربی جاسوس' ______ از: نعیم آسی

۶۔ 'عظیم آدمی' ______ (سوانح چودھری افضل حق مرحوم و مغفور) از نعیم آسی

۷۔ 'نقوشِ افضل حقؒ' (چودھری افضل حقؒ کے اقوال و افکار کا دلآویز مجموعہ) ترتیب: نعیم آسی



وزیر پورہ سیالکوٹ